ریاضِ ادب

یعنی

بی اے کے لازمی اردو نصاب کا حصّہء نظم

مرتبہٗ

ڈاکٹر محمدؐ صادق ، ایم اے ، پی ایچ ڈی،
صدرِ شعبۂ انگریزی ، دیال سنگھ کالج، لاہور

و

سید عابد علی عابدؔ، ایم اے، ایل ایل بی،
سابق پرنسپل، دیال سنگھ کالج ، لاہور

سنہ ۱۹۶۰ء

پنجاب یونیورسٹی پریس

لاہور

ریاضِ ادب

یعنی

بی اے کے لازمی اردو نصاب کا حصّۂ نظم

مرتبۂ

ڈاکٹر محمدؐ صادق، ایم اے، پی ایچ ڈی،

صدر شعبۂ انگریزی ، دیال سنگھ کالج ، لاہور

سید عابد علی عابد ، ایم اے، ایل ایل بی ،

سابق پرنسپل، دیال سنگھ کالج، لاہور

۱۹۶۰ء

پنجاب یونیوسٹی پریس

لاہور

فہرست مضامین

(الف) منتخب شعرأ کے حالات اور ان کے کلام پر انتقاد ۔

سید عابد علی عابد ۔

(ب) اردو کے اصناف کلام کا ایک سرسری جایزہ ۔

(ج) انتخاب غزلیات

صفحہ

صفحہ

(د) منظومات

مثنوی

قصاید

مراثی

ساقی نامہ

صفحہ

متفرقات

صفحہ

ابتدائیہ

دیگر فنون لطیفہ کی طرح شاعری کی غرض و غایت مسرت بہم پہنچانا ہے - شاعری میں یہ مسرت الفاظ و معانی یا ہیئت و مواد کی متناسب ہم آہنگی اور امتزاج سے پیدا ہوتی ہے ، لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ مطالب اور الفاظ دو مختلف یا قابل تقسیم چیزیں نہیں ، بلکہ وہ دونوں ایک ہی ناقابل تفریق حقیقت کے دو پہلو ہیں - اس لیے اعلی تریں شاعری وہ ہے، جس میں یہ دونوں پہلو بہ یک وقت پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوں ، مگر کسی مبتدی کو اعلے و ارفع شاعری سے مانوس کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ابتداءً اس کا ایسی شاعری سے تعارف کرایا جائے، جس کی ظاہری آب و تاب جاذب نظر ہو اور اس کے اشتیاق کو ہر قدم پر تیز تر کرتی رہے - جس طرح ہم باہمی ارتباط میں لوگوں کی ظاہری خوبیوں یا خصوصیات سے متاثر ہوتے ہیں ، بعینہ دنیاے شاعری میں ہم الفاظ کی نوک پلک، تراش خراش، اوزان کی موسیقی، محاورے کی چاشنی اور قافیہ و ردیف کی سحر آفرینی سے مسحور ہوتے ہیں - اور جب الفاظ کا افسوں کارگر ہو جاتا ہے، تو قاری کی طبیعت خود بخود حسن معنی کی طرف راغب ہو جاتی ہے اور اس طرح فہم و تفہیم کی دشوار گھاٹیاں ایک خوشگوار راستے میں تبدیل ہو جاتی ہیں - یاد رہے کہ ہیئت سے شیفتگی مطالعۂ شعر کی منزل اولیں ہے ، منتہا نہیں - لیکن جب تک اس سے تعلق خاطر پیدا نہیں ہوتا، مبتدی کے قدم منزل کی جانب تیزی سے نہیں اٹھ سکتے -

ما صدر، متذکرہ اہم نکات کے پیش نظر اس انتخاب مس شاعری

کے جمالیاتی پہلو کو خاص اہمیت دی گئی ہے اور غزلوں کے ضمن میں الفاظ، کے صوتی اثرات کی دل آویزی کو خاص طور پر مدنظر رکھا گیا ہے -

لیکن اس انتخاب کا واحد مقصد حظ آفرینی نہیں، بلکہ طلبہ اور طالبات کو اردو نظم کے ارتقأ اور اس کے مختلف اصناف کی خصوصیات سے آگاہ کرنا بھی ہے - چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ یہ انتخاب بیشتر اصناف سخن پر حاوی ہے - ممکن ہے کہ افتاد طبع یا تربیت کی بنا پر آپ کسی ایک صنف سے لطف اندوز نہ ہو سکیں، لیکن حصول علم کے لیے شاعری کا یہ ارتقائی پہلو اتنا ہی وقیع ہے، جتنا کہ جمالیاتی -

چونکہ اعلے و ارفع شاعری طبیعت انسانی کے مستقل پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے، اس لیے اس کی تازگی میں فرق نہیں آتا - وہ ایک زندۂ جاوید حقیقت ہے - بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اکثر قاری موانست و عادت کی بنا پر اس بادۂ دیرینہ میں وہ لذت پاتے ہیں، جو جدید مشروبات میں نہیں ملتی، لیکن چونکہ شاعری بہ یک وقت طبائع انسانی کے مستقل پہلوؤں کے ساتھ ساتھ عصری رجحانات کی آئینہ‌دار بھی ہوتی ہے، اس لیے اس سے پوری طرح متکیف ہونے کے لیے قاری کو بسا اوقات اپنے تئیں نادیدہ فضا میں بھی منتقل کرنا پڑتا ہے - عہد جدید کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت البتہ اسے ان مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑتا، کیونکہ جدید شاعری عصر حاضر کی ذہنیت اور ماحول کی عکاسی کرتی ہے اور چونکہ قاری ان سے پوری طرح مانوس ہوتا ہے، اس لیے وہ اس کی مسرتوں سے بے کم و کاست متکیف ہوتا ہے - ممکن ہے کہ جدید اردو شاعری اپنے ہیئتی تجربات کی بنا پر

غیرمانوس ثابت ہو، لیکن چونکہ وہ اس کے اپنے عہد کی پیداوار ہے، اس لیے اس کا ہمدردانہ مطالعہ ضروری ہے ۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے اس انتخاب میں جدید شعرا کا کلام بھی شامل کر لیا گیا ہے اور امید ہے کہ کُلّ جدیدٍ لذیذٌ کے بموجب اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

انتخاب کے معاملے میں مجوزہ تقسیم کار پر عمل کیا گیا ہے ۔ چنانچہ ذیل کے انتخاب کے ذمےدار ڈاکٹر محمد صادق ہیں اور باقی ماندہ کے سید عابد علی عابد :-

غزل : ولی سے لے کر فراق گورکھپوری تک (اس میں سید عابد علی عابد کی غزلیں بھی شامل ہیں) ۔

مثنوی : مثنوی نسنگ نامہ ۔

قصائد : گھوڑے کی ہجو میں۔

مخمس : زمانہ کی شکایت ۔

مراثی : مرثیہ انیس۔

انتخاب کلام اقبال، حفیظ جالندھری اور فاخر ہریانوی ۔

مؤلفین

منتخب شعرا کے حالات اور انکے کلام پر انتقاد

ولی(۱)

دکن میں ولی سے پہلے بھی اردو کی شعری روایت ایک خاص رخ اختیار کر چکی تھی دکنی دبستان کے شعراء طبعاً ان فارسی گو شعراء سے زیادہ متاثر ہوئے جنکا تعلق ہندی یا سبک ہندی فغانی سے تھا - یہی وجہ ہے کہ محمد قلی قطب شاہ سے لیکر ولی کے معروف اور غیر معروف شاگردوں تک کم و بیش دکن کا ہر غزل گو وقوع گوئی اور معاملہ بندی کی طرف مایل نظر آتا ہے - یہ اور بات ہے کہ کہیں یہ میلان زیادہ ہے اور کہیں کم - کہیں تصوف نے اس میلان کے جنسی پہلوؤں کو مضامین لطیف کی صورت بخشی ہے اور کہیں عشق کے جنسی پہلو زیادہ اجاگر ہوئے ہیں - بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ خلوص احساس کی وہ صداقت اور جذبے کی وہ حرارت جو اچھی غزل کی خصوصیت ہوتی ہے دکنی دبستان کے تمام جلیل القدر شعراء کے کلام میں پائی جاتی ہے -

ایک طرح سے ولی دکنی دبستان کے غزل گو شعراء کا نمایندہ ہے - اور اسکی غزل میں وہ رنگا رنگی اور تنوع موجود ہے جو سبک ہندی فغانی کے شعراء کی غزلوں میں پایا جاتا ہے -

---

(۱) عام طور پر تذکرہ نگاروں نے تاریخ وفات ۱۱۵۵ھ درج کی ہے لیکن اب بیشتر نقادوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ مولوی عبدالحق کا یہ دعویٰ درست ہے کہ ولی نے ۱۱۱۹ھ میں وفات پائی اسکے وطن مالوف کے متعلق بھی اختلاف ہے - لیکن جدید تحقیقات کا میلان یہ ہے کہ گجراتی تھے -

ایک تو ولی فطرتاً حسن پرست اور عاشق مزاج تھا۔ اس پر سونے پر سہاگہ یہ کہ سیلانی تھا۔ اپنے محبوب دوست ابوالمعالی کے ساتھ بہت سیر و سیاحت کی ہے۔ خوبان گجرات کا اثر جو دل پر ہوا ہے۔ وہ مختلف غزلوں سے جھلکتا ہے۔ مشہور ہے کہ دھلی کی اقامت کے دوران میں ولی نے سعداللہ گلشن کے کہنے پر دکنی لہجہ ترک کر کے ریختہ کہنا شروع کیا یہ دعوی محل نظر ہے۔ ولی کے کلام میں جو بتدریج صفائی، شستگی اور روانی پیدا ہوتی چلی گئی۔ وہ امتداد زماں کا لازمی نتیجہ ہے۔

اس سے پہلے کہا جا چکا ہے کہ ولی کی غزل میں احساس کی صداقت نمایاں نظر آتی ہے۔ متصوفانہ اشعار سے قطع نظر کر لیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسکی محبوبہ کسی تجریدی فلسفیانہ تصور سے عبارت نہیں بلکہ گوشت پوست کی عورت ہے۔ جو یہ بھی چاہتی ہے کہ اسے چاہا جائے اور کسی کو نہیں چاہتی تو کم از کم چاہنے والوں کی چاہت کو ضرور چاہتی ہے۔ اکثر غزلوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی کی محبوبہ دکن کی وہ سلونی، سانوری، سندر، کامنی اور چنچل نازنین ہے۔ جسکے سڈول جسم کا نقشہ اجنتا کی دیواری تصویروں میں دکھائی دیتا ہے۔ وہ غزل دیکھیے جس میں ولی کہتا ہے:-

"اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا"

یہ کہنا مشکل ہے کہ ولی کی غزلوں میں ایک ھی محبوبہ پڑھنے والے کو مد بھری آنکھوں سے جھانکتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جس غزل کا ایک مصرع نقل کیا گیا ہے اسکی موضوع ایک شوخ، بانکی اور تیکھی عشوہ گر ہے لیکن اسکے ساتھ ھی ایسی غزلیں بھی ھیں جنکے

مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی وضع کی ایک با حیا پردہ نشین عورت ملحوظ خاطر ہے۔ مثلاً

لیتا نہیں سلام ہمارا حجاب سوں
اس صاحب حیا کوں ہمارا سلام ہے
آرام جان و دل ہے ولی جسکا دیکھنا
اس نازنیں پیا کوں ہمارا سلام ہے

ولی اس گوہر کان حیا کی کیا کہوں خوبی
میرے پہلو میں یوں آتا ہے جو سینے میں راز آوے

ولی کا کمال یہ ہے کہ اس نے غزل کی روایت کا رخ متعین کر دیا۔ غزل کے تمام امکانات کا جائیزہ لیا۔ کم و بیش تمام معنی خیز علائم و رموز استعمال کیے۔ تشبیہات و اشارات کو تزئین کلام کے لیے نہیں برتا بلکہ مطالب دقیق کی توضیح و تشریح کے لئے استعمال کیا۔ اس نے نہ صرف اردو غزل کا مزاج متعین کیا بلکہ یہ بھی ثابت کیا کہ اس صنف سخن میں بڑی لچک موجود ہے۔ غم یار سے لیکر غم روز گار تک جتنے مرحلے آتے ھیں ان سب کا بیان بڑی خوبی سے کر سکتی ہے۔

ولی کے مذاق سلیم کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے بعض اشعار بالکل عصر حاضر کی غزل کے اشعار معلوم ہوتے ھیں۔ متروک الفاظ کی جگہ دوسرے الفاظ رکھ دیے جائیں تو یہ کہنا مشکل ہوگا کہ یہ ولی کا کلام ہے۔ مثلاً

سجن تم مکھ ستیں الٹو نقاب آہستہ آہستہ
کہ جیسے ہو طلوع آفتاب آہستہ آہستہ

عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں دلبر سے
سوال آهسته آهسته جواب آهسته آهسته

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اسکو
کرتی ہے نگہ جس تن نازک پہ گرانی

میر تقی میر (۱)

میر صاحب کی زندگی کے نشیب و فراز اب کم و بیش روشن ہو چکے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انہیں کم عمری میں اکبرآباد میں اپنے خاندان ہی کی ایک پردہ نشیں خاتون سے محبت ہوئی۔ رسوائی ہوئی تو دھلی آئے ۔ ان کے سوتیلے ماموں خان آرزو نے یہاں ان سے کچھ اچھا سلوک نہیں کیا لیکن اس کے باوجود میر صاحب معترف ہیں کہ انہیں خان آرزو کی صحبت سے بہت فیض پہونچا ہے۔

میر کا زمانہ مغلوں کے زوال و انتشار کا زمانہ تھا ۔ دھلی جو قدیم شرفاء کی وضعداری اور پرانی ثقافت کا گھر تھی۔ یورشوں کے چرکے سہہ رہی تھی۔

سلطنت کی تباهی اور مرہٹہ گردی کی وجہ سے شرفاء کنگال اور کنگال پامال و بےحال ہوگئے ۔ میر نے کچھ زمانہ اس کے باوجود دھلی میں گذارا لیکن آخر ترک وطن پر مجبور ہوے اور لکھنئو پہونچے

---

(۱) صاحب گل رعنا کہتے ہیں کہ بقول مرزا لطف ۱۱۹۷ھ میں دھلی چھوڑ کر لکھنئو آے - اس وقت ساٹھ برس کے تھے - اس حساب سے ولادت ۱۱۳۷ھ کے لگ بھگ پڑتی ہے سنہ وفات ۱۲۲۵ھ ہے کہ ناصح کی مشہور تاریخ ہے واویلا مرد شہ شاعراں]۔

نواب آصف الدولہ کا زمانہ تھا ۔ قصیدہ لکھکر پیش کیا ۔ انہوں نے وظیفہ مقرر کردیا ، جو مرتے دم تک **میر** کو ملتا رہا ۔

میر کی غزل گوئی میں غم یار اور غم روزگار کا نہایت دل پذیر اور دل آویز امتزاج نظر آتا ھے ۔ عنفوان شباب میں جو زخم انہوں نے کھایا تھا ، وہ کبھی مندمل نہ ھوا ، ناسور بن گیا ۔ عمر بھر اس ناسور سے حرمان کا زھر رستا رھا ۔ ایک تو یہ پھر اس کے ساتھ لکھنئو جانے سے پہلے **میر** نے اپنی آنکھوں سے پرانے تمدن کے نقوش مٹتے ہوئے دیکھے سینکڑوں گھر بگڑ گئے ۔ محلہ کے محلہ اجڑ گئے ۔ نہ وہ وضعداری نہ وہ بانکپن ۔

کچھ لوگوں نے، ان باتوں سے گھبرا کر، تصوف کے حیرت خانہ میں پناہ لی ۔ کچھ لوگ اپنے نفس کی بھول بھولیاں میں گم ھوگئے اور خارجی دنیا کی طرف سے آنکھیں ھی بند کر لیں ۔ کچھ لوگوں نے راگ رنگ اور امردپرستی کو فرار کا ذریعہ بنایا ۔

میر کے یہاں ان تمام کوائف کا اظہار ملتا ھے ، تصوف کی چاٹ بھی ھے ، امردوں کا ذکر بھی ھے ، راگ رنگ سے شغف کا اظہار بھی ھے ، کلام میں ابتذال بھی ھے ، لیکن ان تمام باتوں کے باوصف **میر** غالباً اردو کے سب سے جلیل القدر غزل نگار ھیں ۔

ان کی غزلوں میں حرمان کا احساس اتنا شدید ، تیکھا اور شوخ ھے کہ باقی تمام جذبات اس کے مقابلہ میں پھیکے اور مدھم معلوم ھوتے ھیں ۔

وہ جو صورت زیبا انہوں نے عنفوان شباب میں دیکھی تھی ، وہ ھمیشہ آئینہ خیال میں جلوہ گر رھی ۔ عمر بھر اسی کے روپ کی نظیر

ڈھونڈھتے رہے - لیکن دلکو کہیں سکون نہیں ملا - یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں اس قسم کا تضاد اکثر پایا جاتا ہے۔

شعر

تاکنا جھانکنا کبھو نہ گیا
دل سے شوخ رخ نکو نہ گیا

جیتے جی کوچہ دلدار سے جایا نہ گیا
اسکی دیوار کا سر سے میرے سایا نہ گیا

جس چیز کو نفسیاتی اصطلاح میں ترفع کہتے ہیں، **میر** کی غزل اسکی بہترین مثالیں پیش کرتی ہے - وہ ذوق عمل، وحدت و حرارت جو عشق سے مخصوص ہوتی ہے، اس سے انہوں نے غزل سرائی میں کام لیا - یوں انہوں نے غم‌ھاے روزگار سے سمجھوتہ بھی کر لیا اور سخن سرائی کے مقام بلند تک بھی پہونچ گئے - وہ اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوے کہتے ہیں :-

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا
وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

میر پیچیدہ تشبیہات اور استعارات سے گریز کرتے ہیں - عموماً سامنے کے پامال لفظ استعمال کرتے ہیں لیکن جذبہ کی شدت ان الفاظ میں جوہری توانائی سمو دیتی ہے - الفاظ کی ترتیب نشست اور انتخاب کی یہ صورت ہے کہ شوخ اور تیکھا نغمہ پیدا ہونے کی بجائے دھیمی دھیمی خوش نوائی کا شعور حاصل ہوتا ہے - اس چیز کو اصطلاح میں کلاسیکی توازن اور ضبط و اعتدال کہتے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے

میر صاحب اپنے آپ کو لیے دئے ہوے بات کر رہے ہیں کھل کر بات نہیں کرتے - اور کچھ نہیں تو ان کے اور عام آدمیوں کے درمیان شعر کے علایم و رموز کا پردہ ہی حائل رہتا ہے ان اشعار پر غور کیجئیے : -

دل پر خوں کی اک گلابی سے
عمر بھر ہم رہے شرابی سے

اشک آنکھوں سے کب نہیں آتا
لہو آتا جب نہیں آتا
صبر تھا ایک مونس ہجران
وہ بھی مدت سے اب نہیں آتا

پکتا رہا جو پھوڑا سا یوں ساری رات دل
تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جائے گا
اے میر اسکی یاد نہیں خوب باز آ
نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

میر درد(۱)

سید خواجہ میر درد نے گویا تصوف اور موسیقی کی آغوش میں پرورش پائی تھی - حال و حال سے قول و قوال کا تعلق ظاہر ہے - تمام تذکرہ نگار باتفاق آراء لکھ رہے ہیں کہ ہندوستان کی کلاسیکی سنگیت کے ماہر تھے اور سجادہ نشین تھے - سجادہ نشینی اور سنگیت کا ذوق ان کے خاندان کو گویا ورثہ میں ملا ہے - سید ناصر نذیر فراق جو یادگار خواجہ میر درد کہلاتے تھے اور بیسویں

(۱) رام بابو لکھتے ہیں کہ انکا سنہ ولادت ۱۱۳۳ھ ہے اور سنہ وفات ۱۱۹۹ھ ہے - صاحب گل رعنا بھی یہی سنہ وفات دیتے ہیں -

صدی کے آغاز میں دھلی کے قدیم وضعداری کی منہ بولتی تصویر تھے۔ انہیں کے خاندان سے تھے، بہت گنواں تھے اور نثر اتنی پیاری لکھتے تھے کہ انگلیاں چوم لینے کو دل چاھے۔

میر درد درحقیقت قلندرانہ وضع رکھتے تھے۔ دھلی پر تباھی نازل ہوئی اور لوگ لکھنئو پہونچے تو احباب نے **میر درد** سے بھی لکھنئو چلنے کیلیے کہا۔ لیکن وہ پاؤں توڑ کر دلی بیٹھے تھے جان دیکر اٹھے۔

درد کا دیوان بہت مختصر ھے لیکن بقول صاحب آب حیات سر تا پا انتخاب ھے۔ غزل میں رکاکت، ابتذال یا چھچھورپن کی پرچھائیں تک نہیں پڑتی۔ ان سے پہلے بھی اگرچہ اردو کی شعری روایت اپنے دامن میں متصوفانہ مضامین رکھتی تھی لیکن **میر درد** کی غزل کا اسلوب ھی نرالا ھے۔ آواز بالکل نئی ھے۔ لہجہ بدلا ھوا نظر آتا ھے۔

بات یہ ھے کہ ایران میں **ابوسعید ابوالخیر** کے زمانہ ھی میں تغزل کے تمام علایم و رموز تصوف سے مستعار لے لیے تھے اور انہیں حسب دلخواہ معانی بخشے تھے کہ می شراب یا محبت حقیقی کی علامت ٹھہری، صوفی خراباتی اور رند کہلائے، دل نے ساغر کا لقب پایا، جہاں ارباب حال و قال جمع ھوتے تھے، وہ جگہ خرابات کہلائی، اسی طرح زلف خال اور رخ کے معانی بھی بدلے گئے۔ معرفت کی راہ میں جو مرحلے طے کرنے پڑتے ھیں انہیں منازل و مقامات کہا گیا۔ صوفی راھرو(۱) اور سالک ٹھہرا۔

---

(۱) داغ نے کیا مزے کا شعر کہا ھے:

رھرو راہ محبت کا خدا حافظ ھے
اسمیں دو چار بڑے سخت مقام آتے ھیں

اور تاثیر کا یہ مصرع دیکھیے:

مزلیں آتی ھیں اسمیں نہ مقام آتے ھیں

درد نے پہلی بار اردو شعر کو باقاعدہ تصوف کے دقیق مطالب سے روشناس کرایا ۔ تغزل کی اصطلاحیں استعمال کیں اور تصوف کے مضامین ادا کیے ۔ یہی وجہ ہے کہ انکی غزلوں میں وہ جوش و ولولہ تو نہیں، جو مثال کے طور پر **جرأت** اور **غالب** کے یہاں ملتا ہے، لیکن ایک خاص کیفیت کا اظہار ضرور ہے جسکا بیان لفظوں میں نہیں آتا ۔ یہ کیفیت خدا اور انسان کے باہمی روابط کے شعور سے مربوط ہے ۔

درد نے عبد اور معبود، خالق اور مخلوق کے تعلقات اور روابط کا بیان بہت شیریں‌زباں اور دل‌نشین اسلوب میں کیا ۔ تصوف کے تمام بنیادی مطالب نہایت آسان لفظوں میں بیان کیے ھیں اور پھر چونکہ **درد** کیلیے یہ واردات قال نہیں، حال ھیں ۔ اسلیے ان کے خالص متصوفانہ اشعار میں بھی بڑی تاثیر ہے ۔

انسان لاکھ غم یار کا فریفتہ ہو کہیں ایک مقام ایسا ضرور آتا ہے، جب وہ اس مقام سے ذرا آگے نکل جاتا ہے اور معمولی سطح سے ذرا بلند ہو کر سوچتا ہے ۔ **درد** کی غزل ایسے ھی عالم میں پڑھنے والے کے دل پر گویا نازل ہوتی ہے ۔ چند منتخب اشعار دیکھیے :-

دل بھی تیرے ھی ڈھنگ سیکھا ہے
آن میں کچھ ہے، آن میں کچھ ہے

تر دامنی پہ شیخ ھماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

یہی پیغام **درد**(۱) کا کہنا ، گر صبا کوے یار میں گذرے
کون سی رات آن ملیے گا ، دن بہت انتظار میں گذرے

سودا(۲)

(۱) غزل

سودا نے همعصر شعراء کی طرح خاں **آرزو** سے بہت فیض اٹھایا۔ اسمیں کوئی شک نہیں کہ وہ قادرالکلام تھے یعنی قصیدہ ہو یا غزل ، مثنوی ہو یا رباعی انکی طبیعت کہیں بند نہ تھی ، لیکن اسمیں کوئی شک نہیں کہ انکا اصل جوہر غزل و قصیدہ ہی میں کھلتا ہے ۔

بعض نقادوں نے انہیں غزل میں **میر** کا حریف قرار دینے کے بعد بات یوں ختم کردی ہے کہ **میر** کی غزل آہ ہے اور **سودا** کی واہ۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کے انتقاد سے پڑھنے والوں کو چنداں فائدہ نہیں پہونچ سکتا ۔

شمس العلما امداد امام **اثر** نے **کاشف الحقائق** میں لکھا ہے کہ غزل گوئی میں انہیں استادی کا درجہ حاصل تھا ۔ انکا کلام درد ، سوز و گداز اور خستگی سے خالی نہیں ہے اور یہ وہ صنعتیں ہیں کہ جو غزل سرائی کی جان ہیں ۔

---

(۱) حالی کی یہ رباعی دیکھیے ۔

فرقت میں بشر کی رات کیونکر گذرے
ایک خستہ جگر کی رات کیونکر گذرے
گذری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی
یہ آٹھ پہر کی رات کیونکر گذرے

(۲) رام بابو کے قول کے مطابق سال ولادت ۱۱۲۵ھ ہے اور سال وفات ۱۱۹۵ھ - صاحب گل رعنا بھی یہی سنین دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ستر برس کی عمر میں وفات پائی ۔

ان باتوں کے باوجود اثر لکھتے ہیں کہ غزل نگاری میں سودا ، میر کے ہم مرتبہ نہیں۔ یہ درست ہے ، لیکن اسکی وجہ یہ نہیں کہ سودا میں جوہر شعرگوئی کی کمی تھی - اصل وجہ یہ ہے کہ بظاہر سودا اس کیفیت سے متأثر نہیں ہوے - جسے حرمان عاشقی کہتے ہیں -

نفسیاتی ژرف نگاہی اور تہ داری کے اعتبار سے سودا کی غزل بہت بلند پایہ ہے - معانی کی بہت سی سطحیں ان کے اشعار میں پوشیدہ ہوتی ہیں اور جوں جوں غور کیجیے، معلوم ہوتا ہے کہ ان کے الفاظ میں کئی رمزی اور ایمائی دلالتیں مخفی ہیں -

میر کے سلسلہ میں اشارہ کیا جا چکا ہے کہ انسان حسن کے جس اسلوب خاص سے ابتداء میں متاثر ہوتا ہے - عمر بھر اسکی جستجو میں سرگردان رهتا ہے - یہی وجہ ہے کہ کہنا پڑا - ''لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید'' -

غالب نے اس بات کی طرف، کہ ہر شخص کے نہاں خانہ دل میں حسن و جمال کی ایک معیاری تصویر رنگ آفریں رہتی ہے ، یوں اشارہ کیا ہے :

تمثال جلوہ عرض کر اے حسن کب تلک
آئینہ خیال میں جھانکا کرے کوئی

سودا نے یہ بات ، کہ کسی خاص شخص کے حسن کی نوک پلک دلمیں کھب جاتی ہے درآنحال کہ دوسرے لوگ اسے کوئی اہمیت

نہیں دیتے ، یوں بیان کی ہے - (اور حق یہ ہے کہ بڑے تیکھے پن سے بیان کی ہے) -

سودا[۱] جو تیرا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

اب **سودا** کے چند منتخب اشعار دیکھیے :—

تو نے **سودا** کے تئیں قتل کیا ، کہتے ہیں
یہ اگر سچ ہے ، تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

وے صورتیں الٰہی کس ملک بستیاں ہیں
اب جنکے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپھے ہے مرغ قبلہ‌نما آشیانہ میں

(۲) قصیدہ

سب نقادوں نے **سودا** کی قصیدہ نگاری کی تعریف کی ہے - حقیقت یہ ہے کہ اردو میں **سودا** کے پائے کا قصیدہ‌نگار پیدا نہیں ہوا - امداد امام **اثر** نے ٹھیک لکھا ہے کہ فارسی کے قصیدہ نگار شعراء مثلاً خاقانی ، انوری اور ظہیر فاریابی ، **سودا** سے بہ مراتب بلندتر ہیں ، لیکن اردو میں **سودا** کا کوئی حریف نہیں -

---

(۱) آن ایک اصلاحی لفظ ہے - جس سے ، وہ خاص چھب مراد ہوتی ہے ، جو حسن کی آخر روپ کی جان اور جمال کی روح ہے - اس مسئلہ میں تفصیل سے اپنی کتاب انتقاد میں بحث کر چکا ہوں :

وہ ، جو میں نے چھب دیکھی ، دوستوں نے کب دیکھی
ہمکو چیت سکتی تھی روپ کی پھبن تنہا

غور کرنے سے معلوم ہوگا کہ قصیدہ نگاری میں **سودا** تمام فنی لوازم کا خیال رکھتے ہیں ، مدح اکثر و بیشتر ممدوح کے کوائف کے مطابق کرتے ہیں ، تشبیب اور نسیب سے انکی قوت بیان کا سراغ ملتا ہے - یہ جو **آزاد** نے کہا تھا کہ وہ قادر الکلام ہیں تو انکی مراد یہ تھی کہ **سودا** داخلی واردات کے علاوہ دوسرے مضامین کے بیان کرنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں -

صرف یہی نہیں کہ **سودا** کے قصیدے ادبی اعتبار سے بہت بلند پایہ ہیں ، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ تاریخی دستاویزات ہیں، انکے اکثر قصیدوں سے مترشح ہوتا ہے کہ دہلی کے زوال‌پذیر معاشرے پر کیا بیت رہی تھی - انکے شہر آشوب بالخصوص اس اعتبار سے گراں قدر ہیں -

جن قصاید میں کسی کی تضحیک یا ہجو کی گئی ہے، ان کا مطالعہ بھی سودمند ہے - کہ پڑھنے والے کی نظر معاشرے کے ان رستے ہوئے ناسوروں پر پڑتی ہے ، جن سے **سودا** نے نقاب سرکایا ہے- یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ الفاظ کے طمطراق اور تراکیب کی متانت کے اعتبار سے انکے قصیدے بےنظیر ہیں -

اکثر قصیدوں میں انہوں نے نئے لفظ بھی اختراع کئے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ زبان کی توسیع کے معاملے میں انکا نکتۂ نظر صحت‌مندانہ تھا -

میر حسن(۱)

میر غلام حسن ، غلام حسین ضاحک کے بیٹے ہیں - خلیق کے باپ ہیں اور میر انیس کے دادا ہیں - انکے اجداد میں

(۱) رام بابو تاریخ وفات ۱۲۰۱ھ بیان کرتے ہیں اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ وفات کے وقت عمر پچاس سال سے متجاوز تھی -

میر امامی تھے، جو ہندوستان میں آ کر بس گئے (اصلاً ہرات کے رہنے والے تھے - ان کا خانوادہ علم و فضل کے اعتبار سے معروف تھا - کسی نے ان کے سیّد ہونے پر حرف گیری نہیں کی) -

پہلے اپنے والد سے استفادہ کیا، پھر میر درد سے اصلاح لی، آخر لکھنئو آ گئے اور یہیں انتقال کیا -

انکی شہرت کا دار و مدار اگرچہ بیشتر مثنوی سحرالبیان پر ہے، لیکن به امتداد زماں روشن ہو گیا ہے کہ وہ غزل بھی کہتے تھے اور قصیدہ بھی، کبھی طبیعت لہراتی تھی، تو ہجو بھی لکھ دیتے تھے -

شیخ عبدالقادر مرحوم مدیر مخزن نے انکی مثنوی سحرالبیان (مع گلزار ارم) بڑے سلیقه سے شائع کی تھی، آجکل کمیاب ہے -

سحرالبیان کے متعلق سبھی نقاد لکھتے ہیں که اسکی زبان قریب قریب وہی ہے، جو آجکل بولی جاتی ہے - غزلوں کی زبان کا بھی یہی حال ہے ــــه

ناز سے عشوے سے غمزے سے لگا لیتے ہیں
وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

کیا ہنسے اب کوئی اور کیا رو سکے
دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہو سکے

بتدریج میر حسن کی تصانیف شائع ہو رہی ہیں اور انکی شاعرانه عظمت کے نقوش زیادہ اجاگر ہوتے چلے جا رہے ہیں -

مثنوی سحرالبیان کے متعلق دوست، دشمن سبھی باتفاق آراء کہتے ہیں که اردو میں ایسی مثنوی آجتک نہیں لکھی گئی

(اور میں سمجھتا ہوں کہ شاید مستقبل میں بھی مدت تک ایسے پایہ کی مثنوی نہ لکھی جائے) -

حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں **میر حسن** اور پنڈت دیا شنکر **نسیم** کی مثنویوں کا موازنہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ تسلسل ، کردارنگاری اور منظرنگاری کے اعتبار سے **حسن** کو **نسیم** پر تفوق حاصل ہے -

بات یہ ہے کہ **حسن** کی مثنوی کے کردار پریاں ہوں یا جن ، اصلاً انسان ہیں - پریوں کے پر نوچ لیجیے، تو ایک جیتی جاگتی عورت رہ جاتی ہے اور جن کے منہ سے خشونت کا نقاب اتار لیجیے، تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی ہم انسانوں کی طرح ہے - ہر طرح کے جذبات سے متأثر ہوتا ہے - دوسرے الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ **حسن** کی مثنوی میں مافوق‌الفطرت عنصر بنیادی اہمیت نہیں رکھتا - یہی وجہ ہے کہ ہم پر جنوں ، پریوں اور انسانوں کے تال میل کی داستان گراں نہیں گزرتی کہ تمام کردار انسان ہیں اور ہماری ہی نوع سے تعلق رکھتے ہیں -

میر **حسن** کی نفسیاتی ژرف بینی اور نکتہ سنجی بے نظیر ہے - جس سلیقہ سے انھوں نے شہزادی بدرمنیر کو بالپن کے مرحلوں سے گذر کر عورت بنتے ہوئے دکھایا ہے، اسکی تعریف نہیں ہو سکتی-

کردارنگاری سے قطع نظر مثنوی کے مطالعہ سے **میر حسن** کے زمانے کے تمدنی کوائف کلیتاً روشن ہو جاتے ہیں - دربار داری ، امیروں کی خوشامدانہ گفتگو ، شہزادوں کی تربیت ، محل کے لاڈ پیار اور چونچلے مہریوں اور خواصوں کی گفتگو ، میلوں ٹھیلوں کے مناظر

یہ تمام چیزیں میر حسن کے یہاں اسطرح پائی جاتی ہیں کہ پڑھنے والا اپنے آپ کو اس زمانہ کا ایک فرد محسوس کرتا ہے ۔

سب جانتے ہیں کہ لکھنئو میں راجہ سے لیکر پرجا تک سبھی کو کلاسیکی سنگیت سے لگاؤ تھا ۔ مثنوی میں جگہ جگہ موسیقی کی اصطلاحیں اس خوبصورتی سے استعمال ہوئی ہیں کہ باید و شاید ۔ گائنیں ، مراثنیں اور ناچنے والیاں شعلہ جوالا کی طرح سامنے آتی ہیں اور رقص کا ایک دائرہ سا قائم کرکے غائب ہو جاتی ہیں ۔ البتہ سنگیت کی موہنی سرتیاں کانوں میں گونجتی رہتی ہیں اور پڑھنے والے دیر تک گھونگروں کی وہ جھنکار سنتے ہیں جو میر حسن کے الفاظ میں کہیں مخفی تھی ۔

محل میں جو خواصیں ہیں انکی بےتاب اور بیقرار جوانی بھی جیسے مچلتی ہوئی نظر آتی ہے ۔ حسن نے انکے نام بھی نہایت خوبصورت اور دل‌پذیر رکھے ہیں کہ رمزی اور ایمائی کیفیتیں پڑھنے والوں تک منتقل ہو سکیں ۔

پروفیسر زور نے تنقیدی مقالات میں درست لکھا ہے کہ حسن کھٹکے دار قافیوں کے استعمال میں بہت مشاق معلوم ہوتے ہیں ۔ اکثر وہ قافیہ ایسا استعمال کرتے ہیں کہ اگرچہ بظاہر معلوم نہیں ہوتا لیکن ردیف بھی اسمیں شامل ہوتی ہے[۱] مثلا مالنیں اور بہالنیں ۔

(۱) اس قسم کے قافیوں میں سارا کھیل حرف قید کا ہوتا ہے کہ اسکے بعد کے حروف ردیف کی صورت اختیار کر لیتے ہیں ۔ مثال کے طور پر غزل یوں بھی کہی جا سکتی ہے کہ قافیہ ہو ۔ گلستان ، دامان ، ایمان اور یوں بھی کہ حرف قید کی تخصیص کر دی جائے ، مثلاً بہاران ، یاران ، باران ، ان قافیوں میں ر کے بعد جو حروف آئیں گے وہ ردیف کے حکم میں داخل ہو جائیں گے ۔

زور کی نظر اس بات پر نہیں گئی کہ میر حسن کے یہاں تشبیہات اور استعارات میں نور کی لہروں اور روشنی کے دائروں سے بہت کام لیا جاتا ہے۔ اصلاً میر حسن کی فضاے خیال (Imagery) بصری (Visual) ہے، لیکن بصارت کے دائرہ میں انہیں روشن، منور اور درخشان چیزیں زیادہ محبوب ہیں - یہی وجہ ہے کہ انکی مثنوی کے اکثر اشعار کے الفاظ خود جگمگاتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔

هزاروں هی اطراف میں پالکی
جھلا بورتی جگمگی تالکی

زمیں نور کی، آسماں نور کا
جدھر دیکھو، اودھر سماں نور کا

مغرق بچھی، ایک واں چاندنی
کہ تھی چاندنی جس کے قدموں لگی

گل باغ خوبی لہکتا ہوا
بدن آئینہ سا دمکتا ہوا

ان باتوں پر اس سحر کاری کا اضافہ کر لیجیے کہ مثنوی میں وزیرزادی کا کردار ایسا جیتا جاگتا اور روشن ہے کہ کیا کہیے۔ اسکی شوخ، بیباک لیکن مخلصانہ گفتگو شہزادی بدرمنیر کی متانت کے مقابلہ میں اور بھی زیادہ تیکھی معلوم ہوتی ہے - تضاد کے ذریعہ (Contrast) یوں کردار کا تشخص میر حسن کا خاص کمال ہے -

جرأت(۱)

اس سے پہلے کہا جا چکا ہے کہ اردو کی شعری روایت نے، سب سے پہلے جس فارسی دبستان شعر کا اثر قبول کیا ہے، وہ سبک هندی فغانی ہے۔ معاملہ‌بندی اور وقوع گوئی اس دبستان کی مخصوص صفت ہے۔ **جرأت** سے پہلے بھی جستہ جستہ اردو میں وقوع گوئی اور معاملہ بندی کا سراغ ملتا تھا۔ لیکن **جرأت** نے سب سے پہلے منظم طریقہ پر اپنی غزل کا انحصار ہی کم و بیش ان واردات پر رکھا، جو اصلاً وقوع گوئی اور معاملہ بندی سے مربوط و مخصوص ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں اصطلاحات کا صحیح مفہوم بوضاحت بیان کر دیا جائے کہ غلط فہمی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔

قصہ یہ ہے کہ جب فارسی کے صوفی شعراء نے بتدریج تغزل کے تمام علامات کو متصوفانہ مطالب کے اظہار کیلیے استعمال کرنا شروع کیا تو اسکے نہایت دور رس نتائج پیدا ہوئے۔

(۱) تصوف کی گرم بازاری دیکھ کر ان شعراء نے بھی متصوفانہ اصطلاحات سے کھیلنا شروع کر دیا جنہیں تصوف سے قطعاً کوئی لگاؤ نہ تھا۔ یہ جب مطالب تصوف کا بیان کرتے تھے تو طبعاً لفظی شعبدہ گری سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔

---

(۱) رام بابو انکا سنہ وفات ۱۲۲۵ھ بتاتے ہیں۔ یہ سال اس عرصہ سے برآمد ہوتا ہے۔

ہائے ہندوستان کا شاعر موا

گل رعنا میں بھی یہی سال وفات درج ہے۔ افسوس ہے کہ ولادت کے متعلق کہیں مستند بیان نہ مل سکا اور نہ یہ معلوم ہو سکا کہ انہوں نے عمر کتنی پائی، کہ حساب سے تاریخ ولادت متعین کی جا سکتی۔

اردو شاعری پر بھی اسکا اثر ہوا ، چنانچہ **غالب** نے تو اعتراف بھی کیا ھے

یہ مسائل تصوف یہ تیرا بیان **غالب**
تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

(۲) بعض شعراء نے یہ کمال کیا (اگر یہ کمال ھے) کہ غزل میں مجاز اور حقیقت کو یوں ملا دیا کہ یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ فنکار کا مفہوم کیا ھے ۔ مقصد یہ تھا کہ اہل حال و قال بھی لطف اٹھائیں اور رند بھی واہ واہ کریں ۔ **حافظ** شیرازی کا کلام اس قسم کی شعبدہ گری کی بہترین یا (بد ترین) مثال ھے ۔

(۳) ظاہر ھے کہ جو شعراء واقعی صوفی تھے انکے ھاں محبوب کوئی گوشت پوست کی جیتی جاگتی چیز نہ تھی ۔ انہوں نے ایک مابعد الطبیعاتی تجریدی تصور کو محبوبیت کا لباس پہنا دیا تھا ۔ جامی کی غزلوں میں یہ بات خاص طور پر نمایاں نظر آتی ھے ۔ ارباب صوفیہ ھوں یا تصوف کے مطالب سے کھیلنے والے، بہر حال دونوں جماعتوں کے ھاں محبوب ایک ایسی چیز بن کر رہ گیا ، جو لطافت و نفاست کے اعتبار سے ماورائے فکر تھا ، بت کی طرح سنگین اور جامد تھا ، زندگی کی حرارت سے خالی تھا ، چاھنے والوں سے مستغنی تھا ، خود اپنی رعنائیوں کے حیرت کدہ میں گم تھا ۔ ظاہر ھے کہ ایسے محبوب سے عشق نہیں کیا جا سکتا ، البتہ اسکی پرستش کی جا سکتی ھے ۔

(۴) تصوف کے زیر اثر عشق کا جنسی پہلو دبتے دبتے عملاً مفقود ہو کر رہ گیا۔ عشق ایک پر شور جذبہ کے بجائے ایک بے رنگ تعقل ہو کر رہ گیا۔ رومی، عطار اور اسی قبیل کے صوفی شعراء کی غزلیں ملحوظ خاطر نہیں، کیونکہ انکے یہاں حال ہے قال نہیں، لیکن جو لوگ ان کے نقال تھے، انکی غزلیں بالکل بے رس ہو گئیں۔

جب غزل کا یہ عالم ہو گیا تو فغانی شیرازی نے، کہ بابا فغانی بھی کہلاتا ہے، اسلوب غزل سرائی میں صحت مندانہ ترمیم کی۔ اسنے کھلے بندوں کہا کہ عشق اصلاً ایک جنسی کیفیت ہے، اس آگ میں صرف عاشق ہی نہیں جلتا، محبوبہ بھی کیفیت عشق سے آگاہ ہونیکے بعد اضطراب کے مرحلوں سے گزرتی ہے۔ جسے عشق حقیقی کرنا ہے کرے، لیکن منافقت ترک کر دے، غزل ایسی کہے کہ صاف واضح ہو کہ محبوب حقیقی مراد ہے یا مجازی۔

یہی باتیں ملحوظ رکھ کر فغانی نے غزل سرائی شروع کی۔ غزل کو تصوف کے تجریدی اور مابعد الطبیعاتی تصور سے رہائی بخشی، عشق کے جنسی پہلو کو نمایاں کر کے دکھایا اور کھلے بندوں کہا کہ میں، ان واردات کا مصوّر ہوں، جو چاہنے والوں کو پیش آتی ہیں، میں حسن و عشق کے ناز و نیاز، سوز و ساز اور درد و گداز کا ترجمان ہوں، میں ہجر کی لذتوں اور وصال کے روگ کے گیت گاتا ہوں میں کسی کو چاہتا ہوں اور جسے میں چاہتا ہوں، وہ لاکھ استغنا کا اظہار کرے، مجھ سے اسکا ربط قائم رہے گا۔ عشق کی ہزاروں منزلیں اور ہزاروں مقام ہیں انمیں ایک مقام یہ بھی ہے

که چاهنے والا شادکام و بامراد ہوتا ہے - میں، جہاں اضطراب ہجر کی تصویریں کھینچتا ہوں، وہاں انبساط ملاقات کے نقشے بھی دکھاتا ہوں -

فغانی کے اسلوب غزل‌سرائی نے اس کے معاصروں کو بہت متاثر کیا - چنانچہ ایران کے مہاجر شعراء مثلاً عرفی، نظیری، فغانی کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فغانی کے اندازسخن سرائی کو اپنا لیا ہے - فغانی کا انداز غزل گوئی ہی معاملہ‌بندی اور وقوع گوئی کی بہترین مثال پیش کرتا ہے -

جرأت نے اردو میں غزل‌سرائی کا یہ اسلوب رائج کیا، لیکن اس بات کا خیال رکھا کہ غزل میں ابتذال اور چھچھورپن نہ پیدا ہو - یہی جرأت اور داغ میں فرق ہے - جرأت کی معاملہ بندی متین ہے - داغ کی وقوع گوئی کھلی ڈلی ہے اور عشق کے جنسی پہلوؤں کو بہت ہی نمایاں کر کے دکھاتی ہے - جرأت پیچدار بات بھی کرتا ہے داغ اکثر و بیشتر سطح پر رہتا ہے، گہرائیوں میں کبھی نہیں اترتا - جرأت عشق ہزار شیوہ کی تمام نیرنگیوں سے آگاہ ہے - داغ صرف جنسی لذت اور دل لگی کا طالب ہے - جرأت کے یہاں عشق کا وہ ترفع نہ سہی جو میر کے ہاں ہے، لیکن دلکی لگی ضرور ہے - داغ کے ہاں صرف دل لگی ہی دل لگی ہے - ظاہر ہے کہ دل کی لگن اور دل‌لگی میں فرق ہے(۱) -

---

(۱) حسرت کہتا ہے -

دل لگی بجھا بھی وہ سکتے تو بات تھی
یہ کیا ہوا کہ آگ ہی بھڑکا کے رہ گئے

اور معلوم نہیں کسکا شعر ہے :

مجھ سے اب عاشقی نہیں ہوتی
دل لگی، دل لگی نہیں ہوتی

دوسرے مصرع میں پہلی بار دل لگی دل کی لگی کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور دوسری بھی مذاق کے معنوں میں -

جرأت کے ہاں بھی داغ کی طرح کھلے ڈلے شعر ہیں لیکن انکی تعداد نسبتاً کم ہے۔

جرأت کا مقام متعین کرتے وقت یہ بات ملحوظ رہنی چاہیے کہ اسنے اردو غزل کی روایت کو چند ایک مہلک عناصر سے پاک کر دیا۔ کچھ زوال پذیر معاشرے کی وجہ سے اور کچھ تصوف کی گرم بازاری کی وجہ سے غزل میں امردوں کا ذکر عام ہو چلا تھا۔ چنانچہ کسی کا قول ہے کہ میر کے دیوان میں دلی کے لونڈے بھرے ہوے ہیں(۱)۔

جرأت نے جرأت رندانہ سے کام لیکر ایسے شعر کہے جن سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ضمیر کی صورت کچھ ھی کیوں نہو موضوع سخن عورت ہے لکھنئو کے شعراء نے اس شیوہ کی پیروی کی لیکن سچ ہے کہ اگر جرآت نہ ہوتا تو آجکل کی غزل میں معاملہ بندی کا جو بانکپن دکھائی دیتا ہے اسکا رنگ غالباً بہت پھیکا ہوتا۔

اختر شیرانی کی سلمیٰ، جرأت کی بےنام محبوبہ کا رنگیں عکس ہے اور عہد جدید کے غزل نگار جو عورت کو موضوع سخن بناتے ہیں وہ بہت حد تک جرأت کے مرہون احسان ہیں، جس نے غزل کی پرانی روایت کے پرخچے اڑا دیے اور جس نے فغانی کی طرح بہ تصریح کہا

---

(۱) یہی حال ولی کا ہے کہ غزلیں کی غزلیں امرت لعل کی تعریف میں ملتی ہیں اور ولی ہی پر کیا موقوف ہے دکھنی دبستان سے لیکر غالب کے شاگردوں تک کم و بیش ہر غزل سرا کے دیوان میں کاکل سرکش کے ساتھ سبزہ و خط کا ذکر بھی ضرور ملےگا میر کا یہ شعر اس سلسلہ میں شنیدنی ہے:

حسن تھا اسکا بہت عالم فریب
خط کے آنے پر بھی ایک عالم رہا

که میں ایک عورت سے عشق کرتا ہوں لیکن پھر کیا ہوا لوگ ایسا کرتے آئے ہیں اور کرتے رہیں گے -

این گناہیست که در شہر شما نیز کنند(۱)

ابتک اکثر لوگ آزاد کے اس بیان سے متأثر ہیں - کہ میر نے جرأت کے متعلق کہا تھا کہ تم اپنی چوما چاٹی کہہ لیا کرو شعر کہنا کیا جانو -

ظاہر ہے کہ میر کی یہ رائے قطعاً غلط ہے - جرأت کے یہاں چوما چاٹی بہت تھوڑی ہے ہاں یہ ضرور ہے کہ اسنے عشق کے جنسی پہلو کو ذرا زیادہ نمایاں کیا ہے - جرأت کے ہمعصر نقاد اپنے عہد کی مخصوص نفسیاتی پابندیوں اور الجھنوں کے دائرہ میں محصور تھے - اسلیے انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اسے بہت اہمیت نہیں دینی چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ اردو کی شعری روایت کے ارتقاء میں جرأت کا صحیح مقام متعین کیا جا سکے یہ اسلیے بھی ضروری ہے کہ جرأت نے داغ، میر اور ان کے معاصروں کی غزل سرائی کو بہت متأثر کیا ہے -

---

(۱) پچھلے دنوں دیال سنگھ کالج میں تاریخی نوادر کی جو نمائش ہوئی تھی وہاں راقم السطور نے کلیات جرأت کا نہایت دیدہ زیب نسخہ دیکھا تھا - اسوقت یاد نہیں پڑتا کہ وہ کسکی ملکیت ہے لیکن میرے رفیق کار پروفیسر شجاع الدین اس معاملہ میں تحقیقات کرنے والوں کی رہنمائی کر سکیں گے - جرأت پر کچھ کام ضرور ہوا ہے لیکن

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

اس سلسلہ میں مزید تحقیقات اور تدقیق کی ضرورت ہے -

مصحفی (۱)

دھلی کی حالت ابتر ھوئی تو مصحفی بھی لکھنئو پہنچے - مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے منسلک ھو گئے ان کی استادی کی بڑی دھاک تھی اسلیے سب لوگ قدر کرتے تھے البتہ جب انشا سے ان کے معرکے شروع ھوے تو دو فریق بن گئے - ایک انشا کی حمایت پر مستعد دوسرا مصحفی کا مدح خواں ، ھجوگوئی سے ھزل گوئی اور ھزل گوئی سے فحش نگاری تک بات پہنچی - آخر یہ غبار بیٹھا تو معلوم ھوا کہ مصحفی کی شہرت کو داغ نہیں لگنے پایا ، آب و تاب کا وھی عالم ھے اور قدرت کلام کا وھی رنگ -

مصحفی بہت زودگو اور پرگو تھے ایک زمین میں کئی کئی غزلیں لکھتے تھے اور زور طبع کم نہ ھوتا تھا -

ایک تو یہ اور دوسرے انکے دیوانوں کی ضخامت دیکھ کر عام لوگوں کو یہ خیال گزرا کہ انکے کلام میں بھرتی کے شعر بہت زیادہ ھیں اور کام کے شعر بہت کم -

یہ بالکل غلط خیال ھے - مصحفی اپنی پرگوئی اور زودگوئی کے باوصف نہایت اچھی غزل کہتے ھیں - انکی غزل گوئی کا اسلوب خاص یہ ھے کہ ان کی ذات میں اردو غزل کی تمام روایات گویا جمع ھو گئی ھیں - حسرت کی طرح انہوں نے ھر استاد سے فیض اٹھایا ھے - میر کے لہجے کی دھیمی سہی آنچ اور خود سپردگی کی ادا ،

---

(۱) ۱۱۶۴ھ تا ۱۲۴۰ھ (رام بابو سکسینہ) صاحب گل رعنا بھی یہی سنین دیتے ھیں - آزاد کہتے ھیں کہ ان کا انتقال ۱۲۴۸ھ میں ھوا - وطن مالوف امروھہ ھے -

سودا کی روش کجکلاہی ، جرأت کی وقوع گوئی کا تیکھاپن، درد کی متانت ، سوز کا لطف بیان ، ان کے ہاں سبھی کچھ ملتا ہے۔ ان کے کلام میں دہلی اور لکھنئو کی شعری روایتوں کے بہترین عناصر جمع ہو گئے ہیں ۔ اسکے باوجود ان کے اسلوب میں انفرادیت ہے ۔

راقم السطور کے خیال میں اردو غزل نگاروں میں کوئی بھی ایسا نہیں ، جو مصحفی کی طرح حسن و جمال کی تمام اداؤں کا رازدار ہو ۔ اور نغمہ و ترنم کا محرم اسرار ہو ۔ وہ الفاظ کے انتخاب میں بڑا سلیقہ برتتے ہیں ، بڑی احتیاط سے کام لیتے ہیں ۔ ان کے مصرعوں کا اندرونی آہنگ نہایت خوبصورت ہوتا ہے ۔ متنوع جذبات کی رنگین اور لطیف صورتیں انکی غزلوں میں جلوہ گر ہیں ۔ کہیں جذبہ شدید بھی ہے ، لیکن اکثر و بیشتر ان کی غزل میں ایک خاص رچاؤ ، ٹھراؤ ، اعتدال اور توازن ہے ۔ جسکی مثال صرف حالی کی قدیم غزلوں میں ملتی ہے ۔

دہلی میں غزل کی جو روایات قائم ہوئی تھیں مصحفی نے لکھنئو کو ان سے روشناس کرایا اسکے ساتھ ہی لکھنئو کی غزل میں جو کبھی کبھی نشاط و انبساط کا ایک خاص لہجہ ملتا ہے ۔ اسکے رموز سے بھی انہوں نے آگاہی حاصل کی ۔ یہی وجہ ہے کہ جن شعراء نے ان سے فیض اٹھایا ہے ان کے کلام میں ایک خاص کیفیت ہے ۔ حسرت موہانی ، نکات سخن میں محاسن شعری سے بحث کرتے ہوئے ، جو مثالیں دیتے ہیں ان کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوگا کہ مصحفی کسی بات میں بند نہیں ہیں ۔

رگھوپتی سہائے فراق نے ان کے متعلق لکھا ہے ''جذبات کی میانہ‌روی تخیل و وجدان کو قدم بقدم اس خارجیت کی طرف بڑھا لے چلی ہے، جہاں سے ہم مصحفی کو دھلی اور لکھنئو سکول کے دو راہے پر کھڑا یا آگے بڑھتے ہوئے دیکھتے ھیں''۔ ان کا خیال ہے کہ مصحفی کے کلام کی مرکزی اور مستقل خصوصیت ایک رچا ہوا اعتدال ہے(۱)۔ وہ یہ بھی کہتے ھیں کہ لکھنئو کی زبان وضع کرنے میں مصحفی کا خاص حصہ ہے۔

بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ مصحفی کے کلام میں پہلی بار اردو غزل اپنے تمام امکانات کے ساتھ جلوہ گر ہوئی۔ مصحفی کی ذات میں مختلف دبستانوں کی خصوصیات جمع ہو گئیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو کے بےشمار غزل گو شعراء بالواسطہ یا بلاواسطہ انہیں کے خاندان (یعنی دبستان شعری) سے متعلق ھیں۔

ناسخ (۲)

یہ تحقیق ہے کہ ناسخ نے لکھنئو میں پرورش پائی اور وھیں تربیت حاصل کی۔ زندہ دل خوش باش اور شیریں کلام تھے۔ لکھنئو میں جو اکثر جوڑ توڑ ہوا کرتے تھے ان میں شریک رہا کرتے تھے۔

---

(۱) مصحفی کے کلام کی غنائی اھمیت کے متعلق دیکھئے راقم السطود کا مضمون ''حروف تہجی کی غنائی اھمیت'' انتقاد مطبوعہ ادارہ فروغ اردو لاھور۔

(۲) وفات ۱۲۵۴ھ (گل رعنا۔ تاریخ ادب اردو سکیسنہ۔ مختصر تاریخ ادب اعجاز حسین) اعجاز حسین لکھتے ھیں کہ فیض آباد میں پیدا ہوئے پھر لکھنئو چلے آئے۔ رام بابو کہتے ھیں کہ خدا بخش خیمہ دوز کے لڑکے تھے جو لاھور کا ایک دولتمند سوداگر تھا۔ بہر حال پنجاب سے ان کا تعلق مسلم ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ زبان کے معاملے میں بہت محتاط تھے کہ لوگ یہ کہہ کر حرف نہ رکھیں کہ پنجابی باپ کا بیٹا ہے۔ بہر حال یہ قیاس ہے۔ اور ایک نفسیاتی توجیہہ۔

یہی وجہ ہے کہ ان کے ممدوح کبھی معزول ہوتے تھے تو ترک وطن پر مجبور ہوتے تھے -

جہاں تک شعرگوئی کا تعلق ہے **ناسخ** کا مقام بلند نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ صحیح معنوں میں وہ شاعر ہی نہیں ہیں، قافیہ پیما ہیں، صنعت گر ہیں، محاورے خوب باندھتے ہیں اور روزمرہ پہ ان کو عبور حاصل ہے -

صاحب شعرالہند نے یہ بڑی ناانصافی کی ہے کہ انہیں لکھنئوی دبستان کا نمایندہ شاعر سمجھ کر دہلی کے جلیل‌القدر شعراء سے ان کا موازنہ کیا ہے اور پھر شعر بھی ایسے انتخاب کیے ہیں، جو صرف کلام موزوں کی تعریف میں آتے ہیں -

ناسخ کا اصل کمال یہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان کی ایسی خدمت کی کہ لکھنئو بھی دہلی ہی طرح اردو کا مرکز قرار پایا اور وہاں کی زبان بھی ٹکسالی اور مستند ہو گئی - انہوں نے بہت سے پرانے الفاظ اور کلمات و حروف متروک قرار دیے - شاگردوں کو مشورہ دیا کہ ہندی لفظوں کے بجائے فارسی لفظ برتیں - یوں بےشک ایک طرح زبان کی اصلاح ضرور ہوئی، لیکن ساتھ کچھ نقصانات بھی پہنچے -

حسرت موہانی نے متروکات سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ **ناسخ** نے کچھ کلمات خواہ مخواہ متروک کر دیے - راقم‌السطور کا خیال ہے کہ **ناسخ** کے کہنے پر انکے شاگردوں نے ہندی لفظوں سے جو اجتناب کیا اس سے بھی زبان کو نقصان پہنچا - کئی رس بھرے کلمات سے اردو محروم ہو گئی - عصر حاضر کے شاعر اب پھر ہندی کی طرف مائل ہوئے ہیں -

متروکات کے معاملے میں بھی اب وہ سختی نہیں برتی جاتی ، جس کی ناسخ نے تلقین کی تھی ۔

ناسخ کے شاگردوں میں بہت جید علماء اور فضلاء شامل تھے، مثلاً رشک ، منیر، بحر ۔ اثر لکھتے ھیں ۔ ''ناسخ نے اردو کو خراش تراش کر ایسا درست کر دیا کہ اب اسکی لطافت اور صفائی فارسی سے کچھ کم نہیں معلوم ہوتی .... شیخ (ناسخ) نے گو الفاظ فارسی سے اجتناب نہ کیا مگر ترکیب ایسی ملحوظ رکھی کہ اردو اردو رہ گئی بلکہ اگر کسی فارسی جملے کو بھی اپنے کلام میں جگہ دی تو فارسی کو اردو کرکے دکھا دیا،، ۔

غزل کے متعلق اثر کی رائے یہ ھے '' وہ خیالات شیخ کی بدولت بڑی کثرت کے ساتھ احاطہ غزل سرائی میں داخل ھو گئے ، جو درحقیقت احاطہ غزل سے باھر ھیں .... اس زور آزمائی کا نتیجہ یہ ھوا کہ واردات و جذبات قلبیہ اور دیگر امور ذھنیہ کے مضامین سے شیخ کی غزلیں معرّا ھوگئیں،، ۔

مطلب وھی کہ ناسخ اچھی غزل نہیں کہہ پاتے اور درحقیقت انہیں غزل گو کہنا ھی نہیں چاھیے ۔ ان کا مقام بس صرف یہ ھے کہ انہوں نے لکھنئو کی زبان کو ٹکسالی بنا دیا اور بس(۱) ۔

---

(۱) صاحب شعرالہند نے آتش کو ناسخ کا حریف قرار دیا ھے (متوفی سنہ ۱۲۶۳ھ) لیکن حقیقت یہ ھے کہ ناسخ تو دراصل غزل گو تھے ھی نہیں ۔ آتش کی غزل میں البتہ کہیں کہیں جذبات کی چنگاریاں چمکتی ھیں ۔ آنہوں نے بھی لکھنئو ھی میں پرورش پائی تھی ، لیکن وہ درباداری سے مجتنب رھے ۔ زندگی قلندرانہ بسر کی ۔ یہی وجہ ھے کہ ان کے کلام میں ایک خاص کیفیت پائی جاتی ھے ۔ ناسخ کی طرح یوں وہ بھی صنعت گر ھیں ، مبالغے سے کام لیتے ھیں ، مضمون آفرینی اور خیال بندی کے شائق ھیں ، ابتذال بھی غزل میں نظر آتا ھے ۔ اسکے باوجود آن کے دیوان میں خاصے اچھے شعر مل جاتے ھیں ۔

ابھی تک اردو میں آتش کے کلام پر سیر حاصل انتقاد نہیں کیا گیا ، نہ غزل نگاری میں آن کا مقام متعین کرنے کی کوشش کی گئی ھے ۔ یاس و یگانہ چنگیزی جو اپنے آپ کو یادگار آتش کہتے تھے، مدعی تھے کہ آن کی غزل بہت بلند پایہ ھوتی ھے ۔

پنڈت دیا شنکر نسیم[۱]

نسیم کی شہرت کا دار و مدار انکی مثنوی گلزار نسیم پر ہے، جو اختصار کے اعتبار سے اردو ادب میں بے نظیر تصور کی جاتی ہے -

حالی، میر حسن کے مقابلے میں نسیم کو کم رتبہ قرار دیتے ہیں، لیکن چکبست کا خیال ہے (اور یہی قرین صواب معلوم ہوتا ہے) کہ دونوں استاد اپنے اپنے رنگ میں فرد ہیں سادگی اور بےتکلفی میر حسن کا حصہ ہے باریک بینی اور معنی آفرینی نسیم کا -

اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں تک مافوق الفطرت واقعات کا تعلق ہے گلزار نسیم اور مثنوی میر حسن میں چنداں فرق نہیں، لیکن اسلوب کلام اور طریق ابلاغ و اظہار میں زمین و آسمان کا فرق ہے- میر حسن کے ہاں صنعت گری ہے لیکن کم - نسیم نے صنعت گری کو شعبدہ گری بنا دیا ہے - ایک ایک مصرعے میں کئی کئی صنعتیں مخفی رکھی ہیں پھر استعارے دور از کار، تشبیہیں بعیدالفہم، کنائے دقیق، مبالغہ غلو کی حد تک پہنچا ہوا ہے -

ان باتوں کے باوجود نسیم کے کردار بھی خاصے روشن اور جیتے جاگتے ہیں، سنگیت کے ماہر نسیم بھی ہیں، اسلیے سنگیت کی

---

(۱) سنہ ۱۲۲۷ھ ۱۲۶۰ھ (رام بابو سکسینہ) کشمیری پنڈت تھے بتیس سال کی عمر میں انتقال کیا اتش کے غاگرد تھے - غزل بھی بہت اچھی کہتے تھے - پنڈت برج نارائن چکبست اور شرر کا معرکہ انکی مثنوی گلزار نسیم کے بارہ میں یادگار زمانہ ہے اور اب کتابی صورت میں معرکہ چکبست و شرر کے نام سے چھپ گیا ہے اس تالیف میں بے شمار لسانی اور ادبی سوال اٹھائے گئے ہیں - اور بہت دلچسپ بحثیں جھیڑی گئی ہیں -

چکبست کے محول کے مطابق وہ ۱۸۱۱ء میں پیدا ہوئے سنہ ۱۸۴۳ء میں وفات پائی -

محفلوں کی تصویر کشی بہت اچھی کرتے ہیں، بعض اوقات محاورہ ایسی خوبصورتی سے نظم کرتے ہیں کہ باید و شاید۔

میر حسن مناظر فطرت کے بیان میں کمال رکھتے ہیں - وہ جب کسی باغ کا بیان کرتے ہیں، تو ہم ہوا کی سرسراہٹ سنتے ہیں، پھولوں کی مہک سے ہمارا مشام جاں تازہ ہوتا ہے، پانی بہنے کی آواز آتی ہے، پرندوں کے سہانے بول کان پڑتے ہیں، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ہم فطری مناظر میں رس بس گئے ہیں یا فطری مناظر ہم میں رس بس گئے ہیں - اسکے برخلاف نسیم واقعہ نگاری میں کمال رکھتے ہیں۔ نہایت احتیاط سے ایسی جزئیات کا ذکر کرتے ہیں، جس سے تصویر کی کلیت روشن ہو جائے -

اثر کا خیال ہے کہ گلزار نسیم میں زبان کی خوبی اور بندش کی چستی تو لاجواب ہے، مگر جذبات قلبیہ کا زور نہیں دکھایا گیا -

بات یہ ہے کہ نفس انسانی کے نبض شناس ہونے کے اعتبار سے حسن کا مرتبہ نسیم سے بلندتر ہے، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ نسیم کے اشعار کی صنعت گری سے پڑھنے والا ایک خاص قسم کی تفریح حاصل کرتا ہے - ان دو شعروں میں جو صنعتیں مخفی ہیں، ان پر غور کیجیے :

زنجیر جنوں، کڑی نہ پڑیو
دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے

کس سوچ میں نسیم ہو بولو
آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

ماں کے غصے کی تصور ان اشعار میں دیکھیے :

عصمت میں لگایا داغ تو نے
لٹوائی بہار باغ تو نے
تھمتا نہیں غصہ تھامنے سے
چل دور ہو میرے سامنے سے

رقص کی تصویر ایک شعر میں یوں کھینچتے ہیں :

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی
خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی

ذوق(۱)

ذوق بہت مرنجاں مرنج اور قانع قسم کے شاعر تھے - جب انکی شہرت ہوئی تو بہادر شاہ **ظفر** کے استاد ہوگئے اور چار روپیے ماھوار تنخواہ پانے لگے (ان دنوں ظفر ولی عہد سلطنت تھے) **ظفر** مسند نشیں ہوے ، تو ان کی تنخواہ بتدریج بڑھتی گئی ، خان بہادر کا خطاب ملا ، ھاتھی عنایت ہوا ، جاگیر میں ایک گاؤں بھی پایا -

انہیں حیدر آباد سے بھی دعوت آئی تھی ، لیکن دھلی کی گلیاں نہ چھوٹیں - آخر یہیں ۵۷ء کے ھنگامے سے پہلے وفات پائی -

مشہور ھے کہ **سودا** کے بعد قصیدہ اگر کسی نے لکھا تو **ذوق** نے لکھا ھے - پہلے عام طور پر یہ خیال رائج تھا کہ **ذوق** کی غزل بہت

---

(۱) ولادت ۱۲۰۴ھ ، وفات ۱۲۷۱ھ (گل رعنا - تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ) وطن دھلی تھا - والد کا نام محمد رمضان - شاہ نصیر کے شاگرد ہوے ، جو صنعت گری میں ناسخ اور آتش کے حریف تھے ، لیکن مومن اور غالب کی معاصرت کی وجہ سے آنکی غزلیں بے رس نہ ہونے پائیں -

محمد حسین آزاد ذوق ھی کے شاگرد تھے - انہوں نے آب حیات لکھ کر استاد کو زندہ جاوید تو کر دیا ، لیکن معاصروں سے ، خاص طور پر مومن سے ، کچھ ناانصافی بھی کی -

گھٹیا ہوتی ہے - **آزاد** نے ''آبحیات،، میں اس طرح طلسم باندھا کہ لوگ عموماً **ذوق** کو **غالب** پر ترجیح دینے لگے - اس کے بعد پھر **غالب** کی شاعرانہ عظمت ایسی اجاگر ہوئی کہ **ذوق** کی غزل گوئی کی اہمیت بالکل جاتی رہی - عجیب اتفاق ہے کہ عصر حاضر کے نقاد پھر **آزاد** کی طرح اسی نتیجے پر پہنچے ہیں کہ غزل میں **ذوق** کا رتبہ خاصا بلند ہے -

فراق نے **ذوق** کی غزلوں کے متعلق صحیح لکھا ہے کہ ان میں وہ خالص اردو پن ہے ، جو کسی اور شاعر کی غزلوں میں نظر نہیں آتا - انکی زبان کی مٹھاس ، رس اور لوچ دلوں کو موہ لینے والی چیزیں ہیں - مطلع وہ خاص طور پر اچھا کہتے ہیں - **فراق** نے اس مطلع کی بہت تعریف کی ہے (اور حق یہ ہے کہ تعریف کا سزاوار بھی ہے) :

جس جگہ بیٹھے ہیں بادیدۂ نم اٹھے ہیں
آج کس شخص کا منہ دیکھ کے ہم اٹھے ہیں

اثر کے قول کے مطابق **ذوق** کی غزل میں سوز و گداز اور خستگی کی کیفیت نہیں پائی جاتی ، لیکن انکی نفیس مزاجی میں کسی کو مجال گفتگو نہیں ہے -

اگرچہ قصیدہ نگاری میں **ذوق** کو بہت شہرت حاصل ہے اور ان کے قصیدوں کے مطالعے سے معلوم ہوتا کہ ان کو اپنے زمانے کے علوم پر دسترس حاصل تھی ، لیکن اس کے باوجود انکی قصیدہ نگاری میں **خاقانی** اور **انوری** کی سی معنی آفرینی نہیں ہے ، ایک قسم کی حسن کاری اور صنعت گری ضرور ہے ، لفظوں کا طمطراق اور ترکیبوں کی چستی بھی نظر آتی ہے ، تشبیب اور گریز بھی سلیقے سے لکھتے

ہیں ، پھر بھی معیار بلند نہیں ہوتا اور پڑھنے والے کو یہی شعور ہوتا ہے کہ قصیدہ نگار اپنا زور طبع بیکار صرف کر رہا ہے ۔

اثر لکھتے ہیں کہ جو شے شاعری کی جان ہے ، وہ **سودا** کے اشعار میں پائی جاتی ہے **ذوق** کے اشعار میں نہیں ، علاوہ ازیں وہ **سودا** کے گھڑے ہوے مضامین باندھتے ہیں ، انکے قصائد میں کوئی جدت کا پہلو نظر نہیں آتا ۔

اثر کی یہ راے اگرچہ دیانت دارانہ ہے ، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انہوں نے **ذوق** سے انصاف کیا ہے ۔

بات یہ ہے کہ قصیدے کی تشبیب یا نسیب میں خلوص یا جذبات کی صداقت نظر آ سکتی ہے مدح میں تو بتدریج مبالغہ کرنا ہی حاصل کلام بن گیا تھا ۔ **ذوق** کے قصیدے پڑھنے کے بعد دل پہ جو خوشگوار اثر مترتب نہیں ہوتا ، اسکی وجہ ہے کہ ہم جانتے ہیں کہ جس **ظفر** کو خدیو دو جہاں اور بادشاہ گیتی ستاں کہا جا رہا ہے ، اسکی حکومت دھلی کے لال قلعے سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی ۔ قصور **ذوق** کا نہیں ، حالات کا ہے ، ہو سکتا ہے کہ **ذوق** محمود غزنوی کی مدح میں قصیدہ کہتا تو **فرخی** اور **عنصری** کے مقام بلند تک پہنچ جاتا ۔

طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ **ذوق** کے قصاید کے مقابلے میں **غالب** کے قصیدے کیوں زیادہ دلنشیں معلوم ہوتے ہیں درآنحالیکہ ممدوح بھی وہی ہے اور کوائف بھی وہی ہیں ۔ اسکا جواب یہ ہے کہ ایک تو **غالب** تشبیب اور نسیب بہت اچھی لکھتا ہے ، اسکی تشبیب سے اسکی طبیعت کی اپچ کا سراغ ملتا ہے ، دوسرے یہ کہ وہ الفاظ کے انتخاب میں زیادہ محتاط ہے ، اسکے ابلاغ و اظہار کے طریقے زیادہ

خوبصورت ھیں ، اسکی گریز مدح کو تشبیب سے اس طرح ملاتی ھے کہ تشبیب کا لطف مدح میں سرایت کرتا ھوا نظر آتا ھے ، مثال کے طور پر وہ قصیدہ جسکا مطلع ھے :

ھاں ، مہ نو ، سنیں ھم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رھا ھے سلام

تشبیب کی اپچ اور دلکشی اور گریز کی خوبی اور دلپذیری کے اعتبار سے بے مثال ھے ۔ شروع سے آخر تک ان کوائف کا بیان ھے ، جو **غالب** کی شخصی زندگی سے مربوط ھیں ۔ مدح میں بھی تغزل کا رنگ قائم ھے ۔ یوں **غالب** نے قصیدے میں تشبیب ، نسیب اور تغزل کو مدح میں اسطرح سمو دیا ھے کہ تعریف کے اشعار بھی تشبیب اور گریز کے اشعار کی طرح تابناک معلوم ھوتے ھیں ۔ اسکے برخلاف **ذوق** کے قصیدوں میں داخلیت کا بالکل فقدان ھے ، تشبیب خالصتاً رسمی ھے ؛ پیرایہ بیان بھی دلپذیر نہیں ۔

بہر حال **سودا** کے بعد **ذوق** کو قصیدہ نگاری میں بڑی شہرت حاصل ھوئی ۔ راقم السطور کا خیال یہ ھے کہ **غالب** کے قصیدے **ذوق** کے قصیدوں سے بمراتب بلندتر ھیں(۱) ۔

---

(۱) یہ بات بصراحت کہہ دینی چاھیے کہ مصحفی اور انشا کے قصیدے بھی سزاوار تحسین ھیں ۔ راقم السطور کے خیال میں انشا کے قصیدوں کا رتبہ ذوق کے قصیدوں سے کسی طرح کم نہیں ، لیکن اتفاق کی بات ھے کہ شہرت ذوق کو زیادہ حاصل ھوئی ۔

انشا کی تشبیب اور گریز میں وھی زور اور خوبی نظر آتی ھے ، جو سودا کے قصیدوں میں پائی جاتی ھے ۔ یہ بھی صاف معلوم ھوتا ھے کہ اسکی طبیعت میں بڑی اپچ ھے ۔ منظر نگاری میں بھی اس نے ابلاغ کا حق ادا کر دیا ھے ۔

نعتیہ قصائد میں محسن کاکوری کا مقام بہت بلند ھے ۔ امیر مینائی نے بھی بعض قصیدے اچھے لکھے ھیں ۔ داغ کا ایک آدھ قصیدہ بھی برا نہیں لیکن جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ھے اتفاق کی بات ھے کہ شہرت زیادہ ذوق ھی کو حاصل ھوئی ۔

غالب(۱)

غالب کے کلام کی اہمیت کے متعلق شدید اختلاف رائے ہے یہی صورت انکے مبلغ علم کے سلسلے میں پیش آئی ہے۔ بجنوری کا قول ہے کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو ہیں، ”مقدس وید“ اور ”دیوان غالب“۔ پروفیسر عبداللطیف کہتے ہیں کہ غالب کا کلام شاعرانہ عظمت سے خالی ہے۔ یاس یگانہ عمر بھر یہ کہتے رہے کہ غالب کو شعر کہنا نہ آیا۔

برہان قاطع پر غالب نے جو اعتراضات کیے ہیں ان میں سے کچھ درست ہیں کچھ غلط، لیکن بہر حال قاطع برہان کے مطالب سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ غالب کی طبیعت میں اپچ تھی اور وہ رہ و رسم عام سے ہٹ کر بات کرنا چاہتے تھے۔

اگرچہ مالک رام مصر ہیں کہ غالب نے عبدالصمد نامی ایک ایرانی سے فارسی زبان کے اسرار و رموز سیکھے ہیں لیکن قاضی عبدالودود کا یہ قیاس قرین صواب معلوم ہوتا ہے کہ غالب نے برہان قاطع کے سلسلے میں جو اعتراضات ان پر ہوے تھے ان سے بچنے کیلیے اپنا ایک فرضی استاد گھڑ لیا، جسے غالب کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جس سے ملنے کا کوئی شخص بھی مدعی نہیں۔

---

(۱) ولادت ۱۷۹۶ء، وفات ۱۸۶۹ء مسلم ہے کہ اکبر آباد کے رہنے والے تھے بچپن بڑے اللے تللے میں بسر ہوا تھا۔ خود ان کے قول کے مطابق پیشہ آباء سپہ گری تھا۔ بہت چھوٹی عمر مین دھلی آگئے تھے اور خاندان لوھارو کی ایک خاتون سے انکی شادی ہوگئی تھی۔

انکی زندگی کی تفصیلات مولانا غلام رسول مہر نے ”غالب“ میں بہت عرقریزی سے جمع کی ہیں۔

علی گڑھ میگزین کے غالب نمبر میں بھی بہت سے سود مند مضامین شائع ہو چکے ہیں، جن میں پروفیسو حمید احمد خان اور مالک رام کے مقالات خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ابتدا میں **غالب** نے غزل‌سرائی میں **بیدل** کا رنگ ملحوظ رکھا لیکن یہ طرز دیر تک نبھ نہ سکی - ایرانی اساتذہ کے کلام کا مطالعہ جو کیا اور ان کے ذوق نے جلا جو پائی تو انہوں نے **بیدل** کی تقلید چھوڑ دی اور اپنا ایک مخصوص اسلوب اور انداز پیدا کیا جسکا لہجہ منفرد اور جسکا مزاج اردو کے باقی تمام شعراء سے بالکل جدا ہے -

حالی نے ''یادگار غالب،، اور **بجنوری** نے ''مقدمہ نسخہ حمیدیہ،، میں **غالب** کی غزل‌سرائی کی جو خصوصیات گنوائی ہیں، ان پر **اکرام** نے ''غالب نامہ،، میں اچھا اضافہ کیا ہے - **اکرام** کے انتقاد میں **حالی** کا سا اعتدال ہے اور **بجنوری** کی سی دقت نظر اور دونوں پر انہیں تفوق یوں حاصل ہے کہ وہ **غالب** کے کلام کی تاریخی ترتیب و تدوین متعین کرنے میں کامیاب ہوگئے ہیں -

پہلے کہا جا چکا ہے کہ **غالب** کی غزل کا مزاج اور اسکے انداز کا لہجہ اردو کے تمام شعراء سے بالکل مختلف ہے، اس کی آواز بالکل نئی ہے، جس طرح **مصحفی** نے غزل کی روایت کے تمام امکانات کو ٹٹولا تھا، اسی طرح **غالب** نے بھی غزل کے تمام امکانات کا جائزہ لیا ہے، لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ **مصحفی** کی غزل امکانات مضمر کی نشاندھی کرتی ہے اور **غالب** کی غزل تمام امکانات کی تکمیل کرتی ہے -

غالب جہاں اردو غزل کی روایت کے تمام علایم و رموز سے واقف ہیں، وھاں انہوں نے اپنی اپچ اپنے ذوق سلیم اور اپنی دقت نظر کی بنا پر قدیم روایت میں نئے عناصر کا اضافہ بھی کیا ہے -

انکی غزل میں **عرفی** کی غزل کی طرح فلسفیانہ تعقلات جذبے میں یوں سمو دیے گئے ہیں کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے مابعد

الطبعیات کے مسائل بھی نہایت خوبصورتی سے غزل کا موضوع بن سکتے ہیں ۔

وہ نفس انسان کی دقیق‌ترین کیفیات اور لطیف‌ترین واردات کا تجزیہ کرتے ہیں اور نہایت معنی‌خیز تشبیہات و استعارات کے ذریعے سے بالکل نئے مطالب و معانی یا جدید اصطلاحات میں تجربات ہم تک پہنچاتے ہیں ۔

ان کی غزلوں میں عشق کا ہر تصور موجود ہے ۔ عشق ایک لطیف اور نفیس جذبہ بھی ہے ، ہوس کی ایک صورت بھی ہے، جنسی تمناؤں کا دوسرا نام بھی ہے ، انہوں نے صحیح طور پر یہ کہا ہے کہ عشق ہزار شیوہ ہے ، اسکے سینکڑوں روپ ہیں ، ہر روپ دوسرے سے مختلف ہے ، دماغ کا خلل بھی عشق ہی ہے ، اور وہ آگ بھی عشق ہی ہے

''کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بنے''

یہی صورت انکی غزلوں میں حسن گریزپا کے بیان کی ہے ۔ ان کے اشعار میں جلوے کی ہر صورت اور دلبری کی ہر شکل جلوہ گر نظر آتی ہے ، وہ بے باک اور بانکی تیکھی محبوبہ ملتی ہے کہ

''چہرہ فروغ مے سے گلستاں کیے ہوئے''

ہوس کو دعوت نظارہ دیتی ہے اور وہ نازنین بھی نظر آتی ہے ، جسکے خیال سے غالب نے :

''صبح موجہ گل کو نقش بوریا پایا''

متین وضع‌دار اور سنجیدہ اطوار نازنین بھی انکی غزلوں میں نظر آتی ہیں اور وہ دلربا عورتیں بھی، جنکی شوخی ''دھول دھپے'' تک پہنچتی ہے

مختصر یہ ہے کہ **غالب** نے حسن کو اور عشق کو ہر رنگ میں اور ہر اسلوب میں دیکھا ہے۔

زندگی بھی **غالب** نے ہر طرح برتی ہے، دکھ بھی اٹھائے ہیں، سکھ بھی دیکھے ہیں، اضطراب کے جہنموں سے بھی گزرے ہیں، ابنساط کی فردوس میں بھی مقیم رہے ہیں، اپنوں کی بے وفائیاں بھی دیکھی ہیں اور غیروں کی یگانگت بھی۔ اسکے باوجود انکے مزاج کا اعتدال اور توازن قائم رہا ہے۔ آلام روزگار نے انہیں پیسا ضرور ہے، لیکن وہ انسان کی طرف سے مایوس کبھی نہیں ہوے، کبھی شدت اضطراب میں انہوں نے یہ بھی کہا ہے :

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جسطرح اسد
ڈرتا ہوں آئینہ سے کہ مردم گزیدہ ہوں

لیکن آخر بات یہاں آکر ٹھہری ہے کہ انہوں نے دشمنوں کو بھی معاف کر دیا ہے، زندگی سے سمجھوتا کر لیا ہے اور کبیر کی طرح اس مقام پر اسرار پر آ پہنچے ہیں، جہاں جلیل‌القدر فنکار کہتا ہے :

روک لو گر غلط چلے کوئی
بخش دو گر خطا کرے کوئی
نہ سنو گر برا کہے کوئی
نہ کہو گر برا کرے کوئی

یہ وہی مقام ہے، جہاں فنکار بنی نوع انسان کی تمام کمزوریوں سے مطلع ہوکر اپنے آپ کو انکی سطح سے بلند پاتا ہے اور زندگی کو ہر طرح برتنے کے بعد پکار اٹھتا ہے :

سفینہ جب کنارے پہ آ لگا **غالب**
خدا سے کیا ستم و جور ناخدا کہیے

غالب کے فلسفیانہ افکار اور اسکی پیچیدگی سے بالعموم نقاد اتنے متأثر ہیں کہ ان غزلوں کی طرف دھیان کم جاتا ہے، جو بظاہر سیدھی سادھی معلوم ہوتی ہیں، لیکن، جن میں معانیٔ نو کی ایک دنیا پوشیدہ ہے، ایسی ہی غزلوں کو سہل ممتنع کہتے ہیں، ان میں لہجے کا کھیل اور شعر کے تیور دیدنی ہوتے ہیں راقم‌السطور نے غالب کی ایک غزل:

کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

رام رچپال شیدا دہلوی سے پڑھی ہے، انہیں کے طفیل سے مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ غالب کی ایسی غزلوں میں، جو بظاہر آسان معلوم ہوتی ہیں، کتنے دقیق اور لطیف معانی پوشیدہ ہوتے ہیں، جس غزل کا مطلع نقل کیا جا چکا ہے، اسکے تین شعر ہیں:

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
کعبہ کس منہ سے جاؤگے غالب
شرم تم کو مگر نہیں آتی

شیدا نے، جن دلالتوں کی طرف توجہ دلائی تھی، ان پر غور کرنے سے اور اشعار میں الفاظ پر صحیح زور دینے سے مفہوم واضح ہوتا ہے۔

پہلے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ جنوں کے بہت سے مقام ہیں، ایک یہ ہے کہ آدمی کو خود اپنی حالت پہ ہنسی آ جائے یہ جنوں

کی خاصی ترقی یافتہ صورت ہے ، لیکن سودا کا ایک مقام اس سے بھی بلندتر ہے وہ یہ کہ انسان بیٹھے بٹھائے ، بغیر کسی وجہ کے ، آپ ہی آپ ہنسنے لگے - یہی مقام اس شعر میں ملحوظ ہے کہ اب ہنسی کسی بات پر نہیں آتی بغیر کسی وجہ کے ہنس پڑتا ہوں بات پر زور دینے سے مطلب واضح ہوگا -

دوسرے شعر کے متعلق بہت قیل و قال ہوئی ہے ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شعر درست پڑھا جائے تو قیل و قال کی گنجایش ہی نہیں رہتی - مفہوم یہ ہے کہ موت کا ایک دن معین ہے ، اسی دن آئیگی - نیند کا تو کوئی دن مقرر نہیں ، وہ کیوں نہیں آتی ، اسے تو ہر رات آنا چاہیے - نیند بھی کیا موت ہوگئی کہ ایک ہی دن آئیگی اور اسکے علاوہ نہ آئیگی -

مقطع میں اس واقعہ کی طرف تلمیح ہے کہ منافق مسجد میں نماز پڑھنے جاتے تھے ، تو آستینوں میں بت لیکر جاتے تھے - خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید میں منافقوں کو متنبہ کیا - **غالب** نے اس تلمیح کو یوں برتا کہ اپنے آپ سے مخاطب ہوکر کہا تمہیں شرم نہیں آتی ، خدا کے گھر جا رہے ہو جہاں شرک کا خیال بھی دل میں نہیں ہونا چاہیے اور حالت یہ ہے کہ دل میں ایک بت کو بیٹھا رکھا ہے اور اسکی پرستش کرتے ہو کیا خدا اس منافقت پر آگاہ نہ ہوگا (۱) -

---

(۱) خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اس بت بیداد گر کو میں

آزاد(۱)

اعجاز حسین مختصر تاریخ ادب اردو میں لکھتے ھیں ۔

''غدر کے ھنگامہ کے بعد نہ صرف ھندوستان کی سیاسی و معاشرتی زندگی پر اثر پڑا بلکہ علمی و ادبی دنیا میں بھی انقلاب عظیم ھوا۔ انگریزی ادب سے روشناس ھوتے ھی اسکے گوناگوں اصناف شاعری سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی جسکا نتیجہ یہ ھوا کہ ڈرامہ مناظر اور مختلف عنوان کی کارآمد نظموں کی ابتدا ھوئی حالانکہ اردو میں جن لوگوں نے اس راستہ کو دکھایا انہوں نے خود باقاعدہ کبھی انگریزی تعلیم حاصل نہ کی تھی ، لیکن صحبت کا اثر اور زبان کی محبت نے دلوں کو ابھارا اور رفتہ رفتہ انہوں نے وہ رھنمائی کی کہ زمانہ کی آنکھیں کھل گئیں ۔ ایک وسیع میدان سامنے دیکھکر پامال راستے اور فرسودہ خیالات سے گھبرا کر اردو کی دنیا نے نئی منزل کی طرف قدم اٹھایا ۔

نثر کی اصلاح فورٹ ولیم کالج سے شروع ھو گئی تھی۔ سر سید اور ان کے ساتھیوں نے علمی مضامین اور اخلاق بحثیں مدلل و مؤثر طریقے سے پیش کر کے ایک نیا راستہ کھول دیا تھا۔ البتہ نظم کی

---

(۱) محمد حسین آزاد دھلی کے رھنے والے تھے اور مولوی محمد باقر کے بیٹے تھے سن ولادت ۱۸۳۲ھ ہے ۔ ذوق کی شاگردی اختیار کی ۱۸۵۷ھ کا ھنگامہ برپا ھوا تو ان پر بھی بلا نازل ھوئی کہ سرکار انگریزی کی نظر میں ان کے والد اور یہ خود مشتبہ قرار پائے ۔ ارسطو جاہ مولوی سید رجب علی کی مدد سے بچ کر نکلے کچھ عرصہ اُن کے مطبع میں کام کیا (مولوی صاحب جگراؤں کے رھنے والے تھے لیکن لاھور میں بھی انکی جائیداد تھی راقم السطور کے دادا اُن کے سب سے چھوٹے لڑکے تھے) پھر لاھور آگئے اور مولوی صاحب ھی کی سفارش سے سررشتہ تعلیم میں ملازم ھو گئے ۔ یہاں اُنہوں نے بہت ترقی کی ۔ حق یہ ھے کہ پنجاب میں اردو کی ترویج کا سہرا آزاد کے سر ہے ۔

ترقی کے لیے زمانہ شاید آزاد و حالی کا منتظر تھا۔ آزاد نے پنجاب میں رہ کر ایک علمی انجمن قائم کی جسکا مقصد اردو شاعری کی اصلاح اور ترقی تھا، جس میں بجائے مصرع کے عنوان دیا جاتا تھا۔ اسی انجمن میں حالی نے اپنی مشہور اور ہردلعزیز نظمیں ''برکھا رت،، وغیرہ پڑھیں۔ جو ملک میں بجلی کی طرح دوڑ گئیں اور عام طور سے مقبول ہوئیں۔

حالی اور آزاد نے شاعری میں نئی روح پھونک دی۔ یہیں سے اس دور کی بنا پڑی جسکا عہد حاضر بھی ممنون ہے۔ شاعری میں ایک ایسا انقلاب آیا کہ اردو کا شاعر حسن کی رسمی دنیا سے الگ ہوکر حقیقت‌پسندی کی طرف مائل ہوا یعنی مبالغہ سے گریز اور محبت کی تنگ دنیا سے باھر نکل کر کورانہ جذبات نگاری کو ترک کرنے لگا کار آمد موضوع پر مختلف شکلوں میں نظمیں نمایاں ہونے لگیں۔ رفتہ رفتہ سیاسی مضامین بھی اردو شاعری کے احاطہ میں آ گئے اور عہد حاضر میں تو اس کثرت کے ساتھ معاشرتی و سیاسی پہلو پر نظمیں آنے لگیں ھیں کہ دوسری چیزیں پس پشت رہ گئی ھیں۔ حقیقت نگاری اس دور کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے (۱)۔،،

آزاد نے جو جدید رنگ کی نظمیں لکھی ھیں ان کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اسلوب اور انداز میں وہ صنعت گری پائی جاتی ہے، جو ذوق اور شاہ نصیر کی تربیت کا لازمی نتیجہ تھی۔ اسکے مقابلے میں حالی کی جدید رنگ کی نظموں میں صنعت گری کم ہے اور احساس کی صداقت قدم قدم پر نمایاں ہے۔ ''برکھا رت،، بہت اچھی نظم ہے، لیکن حق یہ ہے کہ ''فریاد بیوہ،، میں جو سوز و گداز اور جو رس موجود ہے

(۱) اردو اکیڈیمی سندھ، مشن روڈ، کراچی۔

وہ اردو کی نظموں میں بہت کم نظر آتا ہے - اس نظم میں حالی نے ہندی کلمات بھی بڑی خوبصورتی سے استعمال کئے ہیں - یہی وجہ ہے کہ یہ نظم خالص ہندوستانی چیز معلوم ہوتی ہے اور اس بات کا سراغ دیتی ہے کہ اردو زبان ہندؤں اور مسلمانوں کے تمدن کے تال میل سے وجود میں آئی ہے پھر اس پر حالی کا وہ مخصوص انداز بیان قیامت ہے کہ لیے دیے ہوے رہتے ہیں اور اسکے باوجود جذبے کی شدت پڑھنے والے تک منتقل ہوتی رہتی ہے - یہ حالی کا خاص کمال ہے اور اس اعتبار سے ان کے معاصروں میں کوئی بھی ان کا حریف نہیں -

اقبال(۱)

اگرچہ علامہ اقبال مرحوم کے کلام کا اہم‌ترین حصہ فارسی میں ہے - لیکن اردو میں بھی، جو کچھ انہوں نے کہا ہے، اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ شعرگوئی سے ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ پڑھنے والوں کی تفریح طبع کا سامان مہیا کریں -

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے جن، مختلف تحریکات کو جنم دیا تھا، ان میں سر سید کی علی گڑھ تحریک سب سے اہم تھی - سر سید کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال‌پذیر معاشرے کی اصلاح کرے اور مسلمانوں کو مغربی علوم و فنون سے مسلح کر کے عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق زندگی بسر کرنے کا گر بتاے-

(۱) سال ولادت، ۱۸۷۳ء، وطن مالوف سیالکوٹ، سال وفات، ۱۹۳۸ء- اقبال نے ایک ایسے ماحول میں تربیت پائی تھی جہاں مشرق کی اخلاقی اقدار کو سنیت سنیت کر رکھا جاتا تھا - ان کے والد ماجد بھی صوفی منش بزرگ تھے اور ہونہار بیٹے کی اخلاقی تربیت میں بہت کاوش سے کام لیتے تھے یہی وجہ ہے کہ اقبال نے مغربی علوم سے بہرہ‌یاب ہونے کے بعد مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگا جانا پسند نہ کیا، بلکہ اسکے برخلاف مشرقی تہذیب کی پرانی وضع داری، رکھ رکھاؤ، اخلاق، حیاداری اور رفاقت کو زندگی کی اعلیٰ اقدار سمجھ کر برتا -

اقبال بھی ایک حد تک اس تحریک سے متاثر ہوے۔ پہلے ان کا خیال یہ تھا کہ بر صغیر ہند و پاکستان کی نجات کا راز ہندو مسلم اتحاد میں مخفی ہے، چنانچہ انہوں نے اپنے پہلے دور میں جو نظمیں کہی ہیں ان میں **نیا شوالہ** انہیں خیالات کی ترجمانی کرتی ہے۔

بتدریج علامہ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ ہندوستان میں اسلامی ثقافت اور تمدن کا احیاء قیام اور استحکام تبھی ممکن ہے کہ مسلمان حجازی تہذیب کی طرف لوٹیں اور اس معاشرتی نظام کے قیام کی کوشش کریں، جو خلافت راشدہ کے زمانہ میں قائم تھا۔ یہی مقصد سامنے رکھ کر انہوں نے شعر کو اپنے تصورات و افکار کے اظہار کا وسیلہ بنایا اور شروع میں تغزل کی اصطلاحات اور علامات سے سیاسی اور معاشرتی مسائل بیان کرنے کا کام لیا۔

انہوں نے بتصریح کہا کہ مجھے شاعر نہ سمجھا جائے۔ انکے کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انکے شعری مطالب کے بنیادی عناصر یہ ہیں:

۱ - مغربی تہذیب کی بنا استوار نہیں، اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے، لیکن جو معیار سامنے رکھنا چاہیے وہ تہذیب حجازی ہے، جسکی اخلاق اور معاشرتی اقدار عالمگیر اہمیت رکھتی ہیں۔

۲ - عجمی تصوف کا وہ پہلو، جو ترک دنیا کی تعلیم دیتا ہے اسلامی تعلیمات کے منافی ہے۔ وحدت‌الوجود کا نظریہ مہلک حد تک خطرناک ہے۔ انسانیت کی غایت خودی کی ہلاکت نہیں بلکہ خودی کی بقا اور اسکا استحکام ہے۔

۳ - انسان کی ذات میں وجدان کے سرچشمے بھی پوشیدہ ھیں - عقل و خرد پہ اعتماد کرنا ایک حد تک ٹھیک ھے ، لیکن وجدان اور کشف و الہام سے بھی مدد لینی چاھیے -

۴ - رسول پاک؈ کی ذات گرامی ذکر و فکر ، فقر و سلطنت اور علم و عمل کی جامع ھے - اگر انکی سنت کو ملحوظ رکھا جائیگا ، تو مسلمان محفوظ رھیں گے -

۵ - مسلمانوں کو ایک مرکز پہ جمع ھونا چاھیے - افراد کو ھر طرح کی ترقی کرنے کا حق حاصل ھے ، لیکن اجتماعی مفاد بہر حال انفرادی مفاد پر تفوق رکھتا ھے -

۶ - اسلام ایک ایسا عالمگیر نظام معاشرت قائم کرنا چاھتا ھے ، جس میں بندے رنگ ، نسل اور نسب کے اعتبار سے مختلف جماعتوں میں نہیں بانٹے جاتے - وطنیت کا مغربی تصور اسلام کی تعلیمات کے منافی ھے - مسلمانوں میں اسلام ھی قدر مشترک ھے - اسی زنجیر میں سب بندھے ھیں ، اپنے وطن سے محبت ایک طبعی امر ھے ، لیکن وطنیت ایک سیاسی تصور کی حیثیت سے اسلام کو قبول نہیں اور اس معاملے میں اسلام نہ کوئی سمجھوتا کر سکتا ھے نہ لچک کھا سکتا ھے -

۷ - انسان میں ایک خاص قسم کی قوت عمل موجود ھے ، جو کشف حقیقت کے لیے بےقرار رھتی ھے اور جو تمام مشکلات کو عبور کرنے میں مسرت محسوس کرتی ھے - یہ قوت خودی ھے ، جو شعور کا نقطہ مستنیر ھے - یہ اسلام کی بتائی ھوئی حدود میں رھے ، تو صحت مندانہ ھے اور ان حدود سے گزر جائے ، تو سراسر عصیان ھے -

یہ نہ سمجھا جائے کہ اقبال ان فلسفیانہ تعقلات و تصورات کو فلسفیوں کی طرح منظم طریقے پر پیش کیا ہے اور خشک زبان میں بیان کیا ہے۔ وہ لاکھ شاعر ہونے سے انکار کریں۔ انکی شعرگوئی کی قوت مسلم ہے۔ فلسفیانہ تعقلات و تصورات بھی انکے ہاں جذبے میں سموے جاتے ہیں اور نہایت خوبصورت الفاظ کے سانچوں میں ڈھالے جاتے ہیں۔

انکی طویل نظموں میں فکر کا عنصر زیادہ گہرا اور نمایاں ہے، لیکن غزلوں میں غزلیت یا تغزل کا پہلو زیادہ روشن ہے۔ واردات حسن و عشق کا بیان وہ کم کرتے ہیں، لیکن جہاں کرتے ہیں، بہت سلیقے سے کرتے ہیں۔

وہ موسیقی سے آگاہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار میں انداز کی جمالیاتی صفات یعنی ترنم اور نغمہ بہت نمایاں نظر آتی ہیں۔

انکی اردو تصانیف (شعری) میں **بال جبریل** کو بہت بلند مقام حاصل ہے۔ اسی میں "مسجد قرطبہ"، جیسی عالی‌منزلت نظم شامل ہے۔ **ساقی نامہ** بھی اسی تالیف میں‌شائع کیا گیا ہے۔ علامہ کی معروف‌ترین غزلیں بھی **بال جبریل** میں ملتی ہیں۔ مطالب کی رفعت اور ابلاغ و اظہار کی رعنائی کے اعتبار سے **بال جبریل** کو **ضرب کلیم** پر تفوق حاصل ہے، لیکن **ضرب کلیم** میں علامہ نے، جس صراحت اور وضاحت سے اپنا ما فی الضمیر بیان کیا ہے، اسے ملحوظ خاطر رکھا جائے، تو کی اہمیت بھی **بال جبریل** کے برابر ہو جاتی ہے۔

عابد علی عابد

اردو کے اصنافِ کلام کا ایک سرسری جائزہ

یہ انتخاب قصیدہ ، مرثیہ، ھجو، غزل اور مثنوی پر مشتمل ھے - ذیل میں ان کی ھیئت اور معنوی خصوصیات پر اظہارِ خیال کیا گیا ھے -

قصیدہ - قصیدہ کے لغوی معنے متعین نہیں ھو سکے - بعض کا خیال ھے کہ قصیدہ ''قصد،، سے مأخوذ ھے - یہ بھی کہا جاتا ھے کہ قصیدہ کے لغوی معنے ٹھوس یا ابھرا ھوا دماغ ھے - اگر یہ خیال درست ھے ، تو قصیدہ سے مراد ایک پر مغز یا پر معنی نظم ھے - اصطلاحاً اس سے مراد وہ نظم ھے ، جو کسی کی مدح یا ذم کے ارادے سے کہی جائے - اسکی ھیئت کی بابت صرف اتنا جاننا ضروری ھے کہ اسکے اول شعر کے دونوں مصرعے باقی اشعار کے مصرع ھائے دوم سے ھم‌قافیہ ھوتے ھیں - قافیہ کے اس التزام سے نظم کی ھیئت میں حسن ضرور پیدا ھو جاتا ھے ، لیکن اظہارِ مطلب میں دشواری پیدا ھو جاتی ھے - عہدِ سلف میں جبکہ اشکال‌پسندی سرمایۂ ادب مانی جاتی تھی (اور شعراء کی معاش کا مدار، بادشاھوں اور امراء کی مدح پر تھا) یہ صنف بہت مطبوع تھی ، لیکن آجکل جب کہ شاعری بیش‌تر وارداتِ قلبی کی آئینہ‌بردار بن گئی ھے ، اس صنف کا رواج کم ھو گیا ھے -

قصیدہ عموماً ذیل کے اجزاء پر مشتمل ہوتا ہے - **اول** تشبیب یعنی تمہید، **دوم** گریز یعنی تمہید سے مدح کا رخ کرنا، **سوم** تعریفِ ممدوح، **چہارم** حسنِ طلب اور **پنجم** دعا - یہ قصیدۂ مدحیہ کا ذکر ہے - جو قصائد اخلاقی مطالب پر مشتمل ہوتے ہیں، ان میں دعا اور حسنِ طلب وغیرہ کا ذکر (ظاہر ہے کہ) نہیں ہوتا -

قدیم تنقید کی رو سے اعلٰی تشبیب، خصوصاً بہاریہ، قصیدہ کا زیور ہے - اس کے بعد جتنی خوش اسلوبی سے گریز ہو، اتنا ہی قصیدہ بلند ہوگا - مدح میں جس قدر مبالغہ ہو، کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ اشکال، صنائع بدائع، اغراق، درشت اور سنگلاخ زمین اس کا مایۂ افتخار ہیں - آخر میں جس قدر ممدوح کی درازیِ عمر اور فزونیِ جاہ و کمال کی دعا ہو، شاعر کے حسنِ کلام اور شاعرانہ مہارت کا بدیہی ثبوت ہے - علاوہ ازیں قصیدہ میں جتنی بھی علمیت ظاہر کی جائے اور بوقلموں کمالات کا اظہار ہو، مستحسن ہے -

قصیدہ آجکل نہایت کس‌مپرسی کے عالم میں ہے اور شائقینِ ادب اسے درخورِ اعتناء خیال نہیں کرتے، لیکن قرونِ وسطٰی میں اسے تمام اصنافِ سخن پر فوقیت حاصل تھی - بقول مولانا شبلی "جس زمانے میں شاعری کا آغاز ہوا، عرب کی شاعری مدحیہ قصائد پر محدود تھی" - ایرانی شاعری نے بھی اہلِ عرب کی تقلید کی اور ان کی شاعری کی ابتداء بھی قصیدہ سے ہوئی - بعد میں غزل ادب پر چھا گئی، لیکن اس کی ہردلعزیزی سے قصیدہ کے وقار میں ذرا فرق نہیں آیا اور عرصۂ دراز تک اسے کمالِ فن کا نمونہ تصور کیا گیا -

بات یہ ہے کہ عہدِ گذشتہ میں صرف قصیدہ ھی ایک ایسی صنف تھی، جسکی مدد سے شعراء کو سلاطین و امراء کا تقرب حاصل ہوتا تھا۔ آجکل، جب کہ علم و ادب کا چرچا ہے، مصنف نسبتاً آزاد ہے، لیکن شخصی حکومتوں میں شاعری کو بطور ذریعہِ معاش استعمال کرنا ممکن نہ تھا۔ تعلیم صرف اعلٰے طبقہ تک محدود تھی۔ لہذا ادب میں کوئی عام دلچسپی نہ تھی اور متوسط طبقہ، جسے آجکل ادب کی سرپرستی حاصل ہے، مفقود تھا۔ ہر شاعر کی یہی خواھش ہوتی تھی کہ وہ اپنے آپ کو کسی دربار سے منسلک کر کے نہ صرف فکرِ معاش سے مستغنی ہو جائے بلکہ اپنے رسوخ اور وقار میں بھی اضافہ کرے۔ ان اقتصادی اور معاشرتی حوائج کا لازمی نتیجہ مداحی تھا، اور جب تک پرانا سیاسی اور معاشرتی نظام قائم رہا، قصیدہ بھی عروج پر رہا۔ آغازِ جمہوریت سے پرانا نظام آھستہ آھستہ منتشر ہونے لگا اور نتیجہ کے طور پر قصیدہ کا رواج بھی کم ہوتا گیا۔ آجکل جب کہ جمہوریت خوب زوروں پر ہے، قصیدہ، خصوصاً اپنی پرانی وضع میں، ناپید ہو گیا ہے۔ لیکن جب تک پرانا نظام قائم تھا قصیدہ کو تمام اصنافِ شعر پر تفوق حاصل تھا۔ ارباب حکومت کے پاس دولت کی فراوانی تھی اور وہ اپنی داد و دھش سے شعراء کو مالامال کر دیتے تھے۔

صدیوں کے استعمال کے بعد قصیدہ نے عرب میں ایک متعیّن بلکہ جامد صورت اختیار کر لی تھی، لیکن جب اس نے اپنے مولد سے باھر قدم رکھا، تو اس میں چند جزوی تبدیلیاں آ گئیں۔ مثال کے طور پر عربی شاعر اپنی نظم کا آغاز، اکثر و بیشتر، ویران مکانوں، یا سنسان بستیوں کے شکستہ آثار کی رسمیہ منظر کشی

سے کرتا ہے ۔ انہیں دیکھکر اسکا دل بھر آتا ہے اور وہ اپنے ساتھیوں سے درخواست کرتا ہے کہ وہ کچھ دیر توقف کریں، تا کہ وہ ان شخصوں کی، جو کبھی وہاں آباد تھے، اور اب کوچ کر گئے ہیں، یادیں تازہ کرے۔ اس مضمون کو وہ عشقیہ ابتدائیہ سے، جسے نسیب کہتے ہیں، منسلک کرتا ہے، جسمیں وہ اپنے عشق کی شدت اور اپنی محبوبہ سے فراق کی مصیبت پر آنسو بہاتا ہے ۔ بادی‌النظر میں یہ عشقیہ روداد غیر متعلق دکھائی دیتی ہے، لیکن اس میں ایک نفسیاتی رمز پوشیدہ ہے ۔ شاعر اس حقیقت سے خوب واقف ہے کہ رقت آمیز داستانیں سامعین کے جذبۂ ہمدردی کو ابھارنے کا کامیاب ذریعہ ہیں اور وہ جانتا ہے کہ جب قصیدہ کے اگلے حصہ میں وہ ان سے مالی معاونت کا طلبگار ہوگا، تو وہ دل کھول کر اسکی مدد کرینگے۔ پھر اسے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ وہ ان کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے، تو وہ انہیں اپنے حقوق کی طرف توجہ دلاتا ہے ۔ رستہ کی تھکاوٹ، بے خوابی، رات کے سفر اور دوپہر کی تپش کا ذکر کرتا ہے، اور انہیں بتاتا ہے کہ اسکی اونٹنی کتنی کمزور ہو گئی ہے ۔ اس کے بعد وہ مدح کا آغاز کرتا ہے، جسکا ماحصل یہ ہوتا ہے کہ اسکا مربی اپنے تمام اعیان و امثال سے بلند مرتبت ہے، اور اسکے تمام ہمعصر اسکے مقابلے میں بالکل ہیچ ہیں ۔

فارسی اور اردو میں عربی قصیدہ کی دو اہم خصوصیات کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔ چونکہ صحرائے عرب کے مقابلہ میں ایران اور ہندوستان مناظر فطرت کی دولت سے مالامال ہیں، اس لیے یہاں شکستہ اور منہدم عمارات اور ریگ صحرا کی جگہ قدرتی مناظراور باغات

کی دلکش تصویریں پیش کی جاتی ہیں ۔ اس منظر کشی کے بعد مدح کا آغاز ہوتا ہے اور عشقیہ حصہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے ۔

اردو قصیدہ کی سب سے نمایاں خصوصیات مبالغہ ، اغراق اور غلو ہیں ۔ قصیدہ میں ممدوح کے واقعی خصائل یا محاسن یا کارھائے نمایاں کا بالکل ذکر نہیں ہوتا ، بلکہ اسے ایسے فرضی فضائل سے متصف کیا جاتا ہے ، جو نہ ہی آج تک کسی شخص میں پائے گئے اور نہ پائے جا سکتے ہیں ۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قصیدہ سے واقعیت کیوں یکسر مفقود ہوگئی اور اسکی جگہ اغراق نے کیونکر لے لی ؟

بعض محققین کا قول ہے کہ یہ خرافات سراسر زمانہ مابعد کی تخلیق ہے ۔ ابتداً قصیدہ محض حقائق کی روداد تھا ، اور شعراء ممدوحین کے محاسن کی پرخلوص تصویریں پیش کرتے تھے ۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد جب حکومتوں میں زوال آنا شروع ہو گیا اور ممدوح صرف نام کے ممدوح رہ گئے ، تو شاعروں نے مجبوراً مبالغہ کی دنیا میں قدم رکھا اور واقعیت کی کمی کو تخیل سے پورا کیا ۔ اس نقطۂ نظر سے قصیدہ کے معنوی معائب ایک رو بتنزل سیاسی ماحول کا نتیجہ ہیں ۔

مجھے یہ رائے صائب معلوم نہیں ہوتی ۔ اس نظریہ سے یہ لازم آتا ہے کہ متوسطین اور متاخرین شعراء کے ممدوح سب کے سب حسنِ قابلیت سے معرا تھے ۔ لیکن تاریخ اس بات کی شاھد ہے کہ قصیدہ کے معنوی انحطاط کے بعد بھی نہایت جلیل‌القدر بادشاہ اور امراء گذرے ہیں، جنہوں نے سپاہ گری ، عدل گستری ، فیاضی ، علوم کی

سرپرستی اور زہد و اتقا سے بڑا نام پیدا کیا - لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی مدح میں لکھے ہوے قصائد بھی از سر تا پا روایتی مدحت سرائی کے نمونے ہیں - ہندوستان ہی کو لیجیے - کیا اکبر، جہانگیر، شاہجہان، بیرم خاں اور خانخاناں اپنے اپنے رنگ میں اعلی محاسن سے متصف نہ تھے؟ لیکن ان کی توصیف نگاری بھی سراسر رسمی ہے، اور بڑے بڑے صاحب ذوق شعراء نے ان کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملائے ہیں - ایک اور مثال لیجیے - سودا اردو کا سب سے بڑا قصیدہ نگار ہے - اپنے مربیوں کے علاوہ اس نے مذہبی پیشواؤں کی مدح میں قصیدے کہے ہیں - مثلاً ''قصیدہ در نعت حضرت سیدالمرسلین خاتم النبیین احمد مجتبلی محمد مصطفلی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم'' - یا ''قصیدہ در منقبت امیر المومنین اسد اللہ غالب علی ابن ابی طالب صلواۃ اللہ علیہ'' - لیکن یہاں بھی رسمیہ مدحت سرائی اور اغراق سے کام لیا گیا ہے -

تو آخر قصیدہ کے معنوی انحطاط کا سبب یا اسباب کیا ہیں؟

جہاں تک میں دیکھتا ہوں قصیدہ میں مبالغہ کی سرایت کے دو بڑے نفسیاتی سبب ہیں - **اول** ممدوح سے شدید حسن عقیدت اور **دوسرے** ہمچشم شعراء میں رقابت اور مسابقت کی خواہش - پہلی بات کی بابت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ عشق و محبت اور مبالغہ لازم ملزوم چیزیں ہیں - ظاہر ہے کہ دور اول کے وہ شعراء، جنہیں اپنے مربیوں سے عقیدت تھی، انہوں نے ان کے اوصاف کے بیان میں غیر شعوری طور پر مبالغہ سے کام لیا ہوگا - بعینہ یہی نتیجہ شعراء کی باہمی رقابت اور مسابقت کی خواہش سے مرتب ہوا

ہوگا - جب ہر شاعر کی یہ خواہش ہو کہ وہ دوسروں سے بڑھکر تعریف کرے، تو لامحالہ اسے مبالغہ کا رستہ اختیار کرنا پڑیگا - پہلے پہل یہ مبالغہ غیر شعوری تھا ، لیکن جب شعراء کی یہ عادت استوار ہو گئی، تو وہ آہستہ آہستہ محاسنِ شعر میں داخل ہو گیا -

اس اغراق کا ایک نفسیاتی پہلو اور بھی ہے - یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تکرار میں کوئی لطف نہیں - اسکے برعکس گوناگونی اظہارِ مطالب کی جان ہے - اگر ایک نفسیاتی حقیقت کا بار بار ایک ہی طریقہ سے اظہار کیا جاے، تو آخر کار اس کا تمام لطف جاتا رہیگا - اول اول جب کسی سپہ‌سالار کی تعریف کی گئی ہوگی ، تو وہ کچھ اس قسم کی ہوگی - ”تو بہت بہادر ہے،، اسکے کچھ عرصہ بعد اسی شاعر ، یا کسی اور شاعر نے جوشِ مدحت سرائی میں کہا ہوگا - ”تو بہادری میں یکتاے روزگار ہے،، - اسکے بعد ، ” تو رستم و اسفندیار ہے،، - پھر ، ”تو اتنا بہادر ہے کہ رستم و اسفندیار تیری گرد کو نہیں پہنچ سکتے،، - یا ” تیرا نام سنکر رستم و اسفندیار کی روح فنا ہو جاتی ہے،، ، اور آخرکار -

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخ کہن کانپ رہا ہے
رستم کا بدن زیر کفن کانپ رہا ہے
خود عرشِ خداوند زمن کانپ رہا ہے

حاصل کلام یہ ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد جب کثرت تکرار سے ہر مبالغہ‌آمیز بیان بے رنگ ہوتا گیا ، تو شاعروں نے اپنے دماغ پر زور

ڈال کر عجیب و غریب اسلوب اختراع کیے اور اس طرح مبالغہ قصیدہ کی رگ و پے میں سرایت کر گیا۔

ان مثالوں سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ قصیدہ کے معنوی انحطاط کا مواد کی قلت سے کوئی منطقی تعلق نہیں۔

اس نظریہ کی یوں بھی تائید ہوتی ہے کہ جو روایتی اور بے سر و پا مضامین قصیدہ میں جا گزیں ہو گئے ہیں ان کے متوازی اور مماثل مضامین غزل میں بھی داخل ہو چکے ہیں۔ حقیقت نگاری دونوں میں مفقود ہے الا ماشاءاللہ۔ اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ نظریہ مان بھی لیا جائے کہ متاخرین کے ممدوح کمالات سے معرا تھے۔ اس لیے مجبوراً قصیدہ کی بنیاد حقیقت کی بجائے تخییل پر رکھی گئی، تو غزل سے سادگی، خلوص اور حقیقت نگاری کے فقدان کے لئے بھی ہمیں ایسا ہی نظریہ تراشنا پڑیگا یعنی متاخرین کے محبوب میں وہ رعنائی اور دلفریبی، وہ سادگی و پرکاری نہ تھی، جو متقدمین کے محبوب کا طرۂ امتیاز تھی۔

اس بارے میں حیاتیاتی نظریہ یہ ہے کہ کائنات کی تمام اشیا خواہ چھوٹی ہوں خواہ بڑی، مادی ہوں یا غیر مادی۔ چاند، سورج، ستارے، انسان، حیوان، چرند پرند، پھول پھل، درخت، نیز تمام تحریکیں خواہ وہ عقلی ہوں، خواہ معاشری، خواہ ادبی، سب کی سب عُضویہ سے ملتی جلتی ہیں اور عالمِ طفولیت، شباب اور شیب کے ادوار سے گذرتی ہوئی آخرکار مر جاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح اصناف سخن بھی آہستہ آہستہ اپنی توانائی، شگفتگی اور لچک کھوتے چلے جاتے ہیں۔ ان کے موضوعات میں کتنا ہی تنوع، کتنی ہی

ثروت کیوں نہ ہو، بالآخر کار ختم ہو جاتی ہے ، اور پھر تصنع ، مبالغہ اور حقیقت سے فرار کا دور آتا ہے ، جو در حقیقت موت کے مترادف ہے ۔ یہ ایک اٹل اور ہمہ گیر قانون ہے ، لیکن یاد رہے کہ ایک زندہ قوم میں، جہاں زندگی آے دن نت نئے روپ بدلتی رہتی ہے ، نئے موضوعات بھی پیدا ہوتے ہیں ۔ پرانے اسالیب نئے اسالیب کو جنم دیتے ہیں یا پھر پرانے اسالیب کے پیمانوں میں زندگی کی نئی شراب بھر دی جاتی ہے ، لیکن قرونِ وسطیٰ میں فکری ، اقتصادی ، مذہبی اور سیاسی جمود کی وجہ سے زندگی میں تموج نہ تھا اور زندگی سے قوتِ نمو سلب ہو چکی تھی ، اسلئے جب پرانے مضامین ایک ایک کر کے فرسودہ ہو گئے اور شاعروں اور فن کاروں کو کوئی نئی شاہراہِ خیال نظر نہ آئی، تو تکرار سے بچنے کے لیے انہوں نے مبالغہ ، صنائع بدائع اور تخییل کی مدد لی ۔ اس سے یہ مطلب نہ لیا جائے کہ انحطاط کے ادوار میں قوائے تخلیقی مردہ ہو جاتے ہیں ۔ اصل میں انہیں کوئی موزوں نکاس نہیں ملتا اور پرانے مضامین کی بھول بھلیوں میں آوارہ و سرگرداں رہ کر وہ اپنی قوتِ تخلیق کو ادنٰی ظواہر اور معنوی موشگافیوں میں صرف کرنے پر مجبور ہوتے ہیں ۔

جیسا کہ آگے بیان کیا جائیگا ، قصیدہ اپنی ساخت میں غزل سے ایک واضح مماثلت رکھتا ہے ، لیکن اس کے جمالیاتی اور جذباتی خصائص غزل سے بہت مختلف ہیں ۔ غزل کا موضوع عشق ہے ، لہذا اسکی امتیازی خصوصیت سوز و گداز ، سپردگی ، انکسار اور نرم جذبات ہیں ۔ ان معنوی خصوصیات کے پیشِ نظر اسکی زبان ، تشبیہات و استعارات اور اوزان میں بھی وہی لچک اور ملائمت ملتی ہے ۔ اسکے برعکس قصیدہ نگار سامعین کو اپنے علم و فضل سے مرعوب کرنا چاهتا ہے ،

لہٰذا قصیدہ کی ہیئتی اور معنوی شان و شوکت، دھوم دھام، تمکنت، اشکال پسندی، نادر تراکیب، علمی اصطلاحات اور تلمیحات، پر شکوہ اوزان اور سنگلاخ زمینیں، درحقیقت ممدوح کی عظمت کی ''علامات،، ہوتی ہیں -

قصیدہ کے غیرمطبوع ہونے کے دو بڑے اسباب ہیں - ایک تو یہ کہ موجودہ دورِ جمہوریت میں سلاطین و امراء عام طور پر مورد عتاب ہیں اور ان کی توصیف نگاری ایک مذموم فعل خیال کی جاتی ہے - دوسرے یہ کہ آجکل شاعری میں جذبات کی تلاش کی جاتی ہے، اور اس باب میں قصیدہ کی تہی دامنی ظاہر ہے -

لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ قصیدہ‌نگار فرومایہ اور خوشامدپسند اشخاص تھے، جو حصول جاہ و منصب کی خاطر ضمیر فروشی گوارا کرتے تھے - یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ ہمارے اخلاقی نظریات سیاسی اور اقتصادی حالات سے متشکّل ہوتے ہیں - آجکل ہمیں قصاید میں تملّق کی بو آتی ہے، لیکن دورِ سلف میں ادبا اور علماء ان کا شوق سے مطالعہ کرتے تھے، تو کیا اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ اخلاقاً ہم اپنے پیش‌رووں سے بہتر ہیں؟ نہیں، ہم ان سے مختلف ہیں - وہ اپنے دور کی پیداوار تھے اور ہم اپنے دور کی -

آخر میں ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ اس تعظیم و تکریم میں مذہب کا بھی ہاتھ تھا - مذہب نے سلاطین کو ظل‌اللہ کا خطاب دے رکھا تھا - عام عقیدہ یہ تھا، کہ اعلیٰ طبقہ کو خدا نے

عروج اور حکومت بخشی ہے، اسلئے ان کی اطاعت اور قدر و منزلت عوام پر واجب آتی ہے -

غالباً یہ سنکر آپ کے جذبہ خودداری کو ٹھیس لگے کہ وہ جذبات ، جو ماضی میں قصیدہ نگاری کے محرک بنے، زندگی سے ناپید نہیں ہوگئے - وہ آج بھی ہم میں کار فرما ہیں - زندگی کے ظواہر بدلتے رہتے ہیں، لیکن مبادیاتِ حیات قائم رہتے ہیں، اور بدلتے ہوے ادوار کے ساتھ وہ اپنی راہیں بدلتے چلے جاتے ہیں - وہی جذبۂ تشکر یا منفعت پسندی جس نے ماضی میں قصیدہ کی شکل اختیار کی، آجکل سیاست‌دانوں ، سر برآوردہ اصحاب کے سپاس‌ناموں ، اور تصانیف کو مشاہیر سے معنون کرنے میں ظاہر ہوتا ہے - اس باب میں ہم لوگ قصیدہ نگاروں کی مبالغہ آرائیوں سے کوئی بہت پیچھے نہیں -

مرثیہ قصیدہ کی ایک شاخ ہے ، اگرچہ اس نے آجکل ایک مستقل صنف کی حیثیت حاصل کر لی ہے - قصیدہ میں زندوں کے محاسن و کمالات کو سراہا جاتا ہے - مرثیہ میں مردوں کو خراجِ تحسین ادا کیا جاتا ہے اور ان کی موت پر تأسف اور آہ و بکا کا اظہار - پس مرثیہ سے مراد وہ نظم ہے جسمیں کسی شخص کی وفات یا شہادت کا حال یا مصیبتوں کا ذکر ہو - چونکہ اردو میں اس صنف کو بیشتر شہداے کربلا کے مصائب کے واقعات کو نظم کرنے کے لئے استعمال کیا گیا ہے ، اس لئے ہمارے ہاں مرثیہ عموماً انہیں معنوں میں استعمال ہوتا ہے -

دیگر اصناف شعر کی طرح اردو مرثیہ کا آغاز بھی دکن میں ہوا ، لیکن وہاں مرثیہ کی وہ صورت نہ تھی جس سے ہم آجکل مانوس ہیں،

دکنی مرثیے نہایت مختصر غنائی نظمیں ہیں، جن میں غنائیہ شاعری کی بیشتر خصوصیات موجود ہیں۔ مثلاً قافیوں کی خوشگوار ترتیب و ترصیع اور الفاظ کی تکرار۔ ان مرثیوں کی امتیازی خصوصیت ان کی سادگی اور خلوص ہے، اور ان میں سوز کی وہ بےلوث کیفیت ہے جو شمالی مرثیوں کی بالعمد رقت آفرینی میں شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔

شمال میں پہلے پہل مرثیے مخمس کی صورت میں کہے گئے، لیکن یہ اسلوب ایک وسیع موضوع کی ترجمانی کے لئے موزوں نہ تھا۔ مسدس کی صورت میں سب سے پہلے مرثیے **سودا** نے کہے۔ شاہان اودھ کی سر پرستی کی وجہ سے اس صنف نے بہت ترقی کی اور **انیس** کے زورِ قلم نے اسے منتہائے عروج پر پہنچا دیا۔

اگرچہ اول سے آخر تک مرثیہ کی روحِ رواں ائمۂ کربلا پر غم و اندوہ اور آہ و بکا کا اظہار رہی، لیکن جوں جوں اس صنف کو ترقی ہوتی گئی، بہت سے ایسے عنوانات اور مضامین جو مرثیہ کے مرکزی موضوع سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے اسمیں شامل ہوتے گئے، جنکی وجہ سے اس صنف میں اچھا خاصہ تنوع پیدا ہوگیا۔ ان میں سب سے مطبوع منظر نگاری ہے۔ صبح و شام کے نظارے، دریا کی روانی، جنگلوں کا سہانا منظر، سبزہ کی طراوت، پرندوں کی نغمہ سنجیاں۔ ان سب سے نہ صرف مرثیوں کی جاذبیت میں اضافہ ہوگیا ہے، بلکہ مستقل گریہ و زاری سے جو افسردگی، یکسانیت اور گھٹن پیدا ہوتی ہے، اس میں، کم از کم وقتی طور پر، تخفیف ہو جاتی ہے۔

مرثیہ کا ایک موضوع کربلا کی ہلاکت آفریں اور شعلہ بار تمازت آفتاب کی منظر کشی ہے۔ اس بارے میں سب مرثیہ نگاروں

نے اغراق سے کام لیا ہے، لہذا ان مضامین میں کوئی دلفریبی نہیں - ہاں وہ لوگ جنہیں مبالغہ پسند ہے تخیل کی ان طرفہ‌کاریوں سے محظوظ ہوتے ہونگے - مرقع نگاری کے لحاظ سے یہ منظرکشی ناکام سہی، لیکن چونکہ اس ہولناک فضا سے شہدائے کربلا کے مصائب کے احساس یا شدت میں اضافہ ہو جاتا ہے، اسلئے فنی اعتبار سے انہیں بالکل بے سود نہیں گردانا جا سکتا -

مرثیہ نگاروں نے ایک اور جدت سے بھی کام لیا ہے- تاریخی صداقت اس بات کی مقتضی ہے کہ کسی واقعہ کو بیان کرتے ہوئے اس ملک کے مخصوص رسم و رواج کی احتیاط سے پابندی کی جائے، لیکن عام طور پر شاعری میں اس اصول کی شدت سے پابندی نہیں کی گئی - مرثیہ نگاروں نے بھی اس معاملہ میں آزادی سے کام لیا ہے اور ٹھیٹھ لکھنوی آداب و رسوم کو اپنی نظموں میں داخل کر دیا ہے-

شبلی کے نزدیک **انیس** کے اسلوب کی دو بڑی خوبیاں ہیں یعنی فصاحت اور بلاغت - فصاحت سے اسکی مراد الفاظ کا بامحاورہ اور باموقع استعمال ہے - بلاغت سے مراد جذبات کی صحیح ترجمانی یا، بالفاظ دیگر، نفسیاتی حقیقت نگاری ہے - **انیس** میں یہ دونوں خوبیاں پائی جاتی ہیں- وہ حیات انسانی کے رموز و حقائق سے کما حقہ آگاہ ہے اور اکثر اوقات اسکے ہاں ایسے نکات ملتے ہیں جن سے اسکے گہرے اور وسیع مشاہدے اور نفسیاتی حقیقت پسندی کا ثبوت ملتا ہے - جہاں تک مبالغہ اور صنائع بدائع کا سوال ہے، اس وقت یہ لازمہ شاعری خیال کیے جاتے تھے اور شاعر سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ ان کے بھرپور استعمال سے کلام کی لطافت اور رنگینی میں اضافہ کرے -

اس معاملہ میں **انیس** اپنے عہد کی پیداوار ہے - ہاں اسمیں شک نہیں کہ ان لفظی رعایات کے استعمال میں اسنے عموماً اعتدال سے کام لیا ہے -

اردو ادب کے چند پر جوش حامیوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ مرثیے یورپ کی **رزمیہ** نظموں کا جواب ہیں - میں اسے محض خوش اعتقادی سمجھتا ہوں - ہمارے مرثیے نہ ہی **رزمیہ** ہیں اور نہ ہی **المیہ** - اگرچہ کھینچ تان سے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ ان میں یہ دونوں عناصر موجود ہیں - اسمیں شک نہیں کہ جنگ کی تیاری، معرکہ آرائی، جنگی جوش و خروش، مبارز طلبی، آلات حرب اور جنگی گھوڑوں کی تصویر کشی سے جنگی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، لیکن یہ سراسر نقالی ہے - **رزمیہ** کی روح **مرثیہ** میں نہیں ملتی -

اس سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ واقعہ کربلا میں **المیہ** کی کمی ہے - معصومین کے مصائب کی داستان **المیہ** سے فطری مناسبت رکھتی ہے، لیکن اسکے بیان میں ضبط اور متانت کی اشد ضرورت ہے - **المیہ** ہو یا **رزمیہ** ان میں ترفع اور شان پیدا کرنے کے لئے یہ لازمی ہے کہ اسکے کردار، مصائب اور موت کا استقلال اور ثابت قدمی سے مقابلہ کریں، اور تفصیل نگاری میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو ان کے علوِ ہمت، جواں مردی اور آہنی عزم و استقلال کی نقیض ہو - یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مرثیہ میں عام طور پر ان باتوں کا لحاظ نہیں رکھا گیا - مرثیہ میں کرداری مثالیت کو ایک گھٹیا قسم کی جذباتیت پر نثار کر دیا گیا ہے - اگر یہ تنقید درست ہے، تو مرثیہ کا سب سے بڑا

نقص یہی ھے، لیکن اسمیں بیچارے شاعر کا ذرا قصور نہیں۔ اس ناکامی کا راز خود مرثیہ کی غرض و غایت میں مضمر ھے - مرثیہ کی غرض و غایت اول تا آخر شہدائے کربلا کے مصائب اور شہادت کی داستان سنا کر سامعین میں رقت پیدا کرنا ھے - شیعہ حضرات کا یہ بنیادی عقیدہ ھے کہ شہدائے کربلا کی شہادت پر آنسو بہانا جزو ایمان، ذریعہ سعادت اور کارِ ثواب ھے - **المیہ** میں درد اور سوز و گداز کی شاندار مثالیں موجود ھیں، لیکن ان کے بیان میں **ھومر** ایک آھنی ضبط سے کام لیتا ھے - نیز اسکے کردار اپنی مخصوص قسمت کا مقابلہ ایک عجیب شانِ استغنا، استقلال اور ثابت قدمی سے کرتے ھیں- **ھومر** ھو یا **سوفوکلیز**، **شکسپیئر** ھو یا **ھارڈی**، ان کے شاھکاروں کا مجموعی تأثر، وقار اور ترفع کی صورت میں ھوتا ھے -

اگر مرثیہ نگار چاھتے تو وہ بھی اپنے کرداروں کو ایسے ھی زاویہٴ نگاہ سے پیش کر سکتے تھے- لیکن مرثیہ کی علتِ غائی تو دردناک جذبات کو برانگیختہ کرنا ھے - لہذا وہ اپنے کرداروں کو صرف انہیں پہلوؤں سے پیش کرتے ھیں یا عام طرر پر ایسے واقعات اختراع کرتے ھیں، جنکے بیان سے سامعین پر شدت سے رقت طاری ھو جائے - اس طرح وہ اپنے مقصد میں حیرت انگیز حد تک کامیاب ھو گئے ھیں، لیکن جبروت و جلال، عظمت و رفعت کے وہ جذبات جو لازمۂ المیہ ھیں مرثیوں میں بہت کم ملتے ھیں- اگر وہ انہیں داخل کرتے تو مرثیہ بین نہ رھتا اور شیعہ حضرات کے اعتقاد کے مطابق اگر مرثیہ بین نہیں، تو کچھ بھی نہیں -

ھجو: شاعری جذبات کی زبان ھے - اسکے برعکس ھجو، خواہ اس کا ذریعۂ اظہار نظم ھو یا نثر، عقل سلیم کی تحریک سے پیدا ھوتی

ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہجو میں جذبات کے لئے کوئی جگہ نہیں ۔ اکثر ہجویں جذبات سے لبریز ہیں، لیکن یہ جذبات ، مستقل غور و فکر ، تنقید یا، بالفاظ دیگر ، دو متقابل قدروں کے باہم مقابلہ اور موازنہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ ہر بڑے ہجو نگار کے سامنے ایک بلند نظریہ حیات ، ایک اعلیٰ نصب العین ہوتا ہے ، جسے وہ معاشرہ میں فائز دیکھنا چاہتا ہے اور جسکے اطلاق سے اسے معاشرہ کی کوتاہیوں کا احساس ہوتا ہے ۔ وہ دیکھتا ہے کہ دنیا میں سچ کی قدر نہیں، بلند عزائم مفقود ہیں اور موقع شناسی ، دون ہمتی اور خود غرضی اذہان پر مسلّط ہے۔ مذہب کا چشمہ ، ریاکاری یا ماضی پرستی کی آلائش سے گدلا ہو رہا ہے اور سیاست میں خودغرضی اور ابلہ فریبی کی روح خبیثہ جاری و ساری ہے ۔ یہ حالت دیکھکر مختلف ہجو نگاروں پر مختلف کیفیتیں طاری ہوتی ہیں ۔ بعضوں کے دماغ میں غصہ کی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور ان کے جذبات لاوے کی صورت میں بہ نکلتے ہیں ۔ اس قسم کی ہجو نگاری کی عمدہ مثال مسدّس حالی کے چند اجزاء ہیں ، لیکن عموماً ناپسندیدگی کا یہ جذبہ ایک استہزائی شکل میں ظاهر ہوتا ہے ۔ ایسی ہجویں طعن و تشنیع پر مشتمل ہوتی ہیں ۔ تیسری قسم کے ہجو نگار وہ ہیں، جن میں رواداری اور جذبۂ ہمدردی کی فراوانی ہوتی ہے ، ایسے ہجو نگاروں کی ناپسندیدگی ایک زیرِ لب تبسم کی صورت میں ظاهر ہوتی ہے ۔

در حقیقت ہجو کی اتنی ہی قسمیں ہیں جتنے ہجو نگار ۔ ہر ایک کا اپنا اپنا رستہ ہے ، لیکن ان سب میں ایک مشترک خصوصیت ہے، اور وہ یہ ہے کہ ہجو نگاری ایک ناقدانہ عمل ہے ۔ اسکا انحصار

بصیرت اور غور و خوض پر ہے ۔ ہجو نگار اپنے آپ کو تخیل کی دنیا میں نہیں کھو دیتا ۔ وہ نہ ماضی کا گرویدہ ہے اور نہ مستقبل کا ۔ اسے حال سے دلچسپی ہے ۔ اسکا کام روزمرہ زندگی کی بدعنوانیوں ، نقائص اور حماقتوں کو ہم پر واضح کرنا ہے ۔ یہی کام مصلح اور واعظ بھی سرانجام دیتے ہیں، لیکن وہ اپنا کام پند و نصائح سے نکالتے ہیں ۔ ہجو نگار کا آلۂ کار طنز اور رمز و کنایہ ہیں ، جن سے اسکی تنقید میں ایک خوشگوار بانکپن آ جاتا ہے ۔ واعظ کی براہ راست تلقین ہمارے خود مدافعانہ جذبے کو ابھارتی ہے اور ہم اسکا مقابلہ کرتے ہیں، لیکن ہجو نگار کے حملے کا ہمیں اس وقت احساس ہوتا ہے جب اسکا تیر ہمارے دل و دماغ میں پیوست ہو چکا ہوتا ہے ۔

چونکہ ہجو تمامتر اعمال و افعال اور نظریات کی تنقید پر مشتمل ہے ، لہذا وہ نثر کے قریب‌تر ہے ، اور اسکی زبان اور imagery میں روزمرہ کا رنگ غالب ہوتا ہے ۔

نہ لیسنس ہتھیار کا ہے نہ زور
کہ ٹرکی کے دشمن سے جا کر لڑیں
ولے دل سے ہم کوستے ہیں ضرور
کہ اٹلی کی توپوں میں کیڑے پڑیں

یوں تو ہجو نگار کے لیے مواد کی کوئی کمی نہیں ، لیکن اس کے لیے دو عہد خصوصیت سے سازگار ہوتے ہیں۔ انحطاط کا دور اور یا پھر انقلابی یا عبوری دور، جب زندگی کی اقدار میں آویزش حد سے بڑھ جاتی ہے، اور نئے نظریات زندگی پرانے خیالات سے بر سر پیکار

ہوتے ہیں۔ رجعت پسند آزاد خیالوں کا خاکہ اڑاتے ہیں، اور آزاد خیال سلف پرستوں کی بزدلی اور قدامت پسندی کو ہدفِ استہزاء بناتے ہیں۔

پہلی قسم کی ہجو نگاری کی عمدہ مثالیں آپ کو **سودا** میں ملینگی۔ ان میں سے دو آپ کے نصاب میں شامل ہیں۔

ہجو کا مطالعہ کرتے وقت ایک بات کبھی نہیں بھولنی چاہیے۔ اور وہ یہ ہے کہ درحقیقت گریہ و خندہ ایک ہی نفسیاتی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ جب ہم کسی نامعقول یا بےتکے فعل کو عقل کی عینک لگا کر دیکھتے ہیں، تو ہمیں بےاختیار ہنسی آتی ہے۔ لیکن پھر اگر اسی عمل کو جذباتی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے، تو ہم پر غم طاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کسی مصنف کا زاویۂ نگاہ غیرشعوری طور پر بدل جائے اور وہ شعور سے جذبات کی دنیا میں آ جائے، تو اسکی ہجو نوحہ میں تبدیل ہو جائیگی۔ چنانچہ **سودا** کی ایک ہجو(۱) میں ایسا ہی ہوا ہے۔ اسے **سودا** کی ہجوؤں میں شمار کیا جاتا ہے، لیکن یہ آہستہ آہستہ نوحہ میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور اسکا سبب یہ ہے کہ اسے لکھتے ہوے شاعر کے جذبات اسکی تنقید پر غالب آ گئے ہیں۔

دوسری قسم کی ہجو نگاری کا آغاز ادبِ جدید سے ہوتا ہے۔ عہد جدید کا سب سے بڑا ہجو نگار **اکبر** الٰہ آبادی ہے۔ وہ مشرق کی روحانیت کا علمبردار ہے اور اسنے مغرب کی مادیت اور اسکی کورانہ تقلید کو اپنی ظرافت کا نشانہ بنایا ہے۔

ادنٰے قسم کی ہجو نگاری ذاتیات پر اتر آتی ہے۔ اگر اسمیں

---

(۱) ملاحظہ ہوں آئندہ صفحات۔

مزاح کا پہلو نمایاں ہو، تو یہ گوارا ہوسکتی ہے۔ لیکن اگر شاعر گالی گلوچ پر اتر آئے، تو اسکے مطالعہ سے طبیعت منغض ہو جاتی ہے۔

سودا کے ہاں اوپر کی دونو قسم کی ہجویں ملتی ہیں۔

غزل: لغوی معنی عورتوں سے بات چیت کرنا یا عورتوں کے عشق کا ذکر کرنا ہے۔ اصطلاح میں اس سے مراد وہ شاعری ہے جسمیں عشقیہ جذبات کا ذکر ہو۔

غزل پہلے پہل کوئی مستقل صنف نہ تھی۔ اسکا آغاز ان عشقیہ اشعار سے ہوا، جو عربی قصیدہ کا جزو تھے اور جنہیں تشبیب کہا جاتا ہے۔ بعد میں ان اشعار نے ایک جداگانہ حیثیت اختیار کرلی اور اس طرح فارسی اور اردو کی سب سے زیادہ دلآویز صنف کا آغاز ہوا۔ یہ حقیقت، کہ غزل ایک وقت قصیدہ کا حصہ تھی، اس بات سے پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ ہیئت کے لحاظ سے غزل اور قصیدہ میں مکمل مماثلت ہے۔

غزل کی واضح ترین خصوصیت اسکی پریشان خیالی یا وحدت تأثر کا فقدان ہے۔ غزل میں عموماً ہر شعر کا مضمون علیحدہ ہوتا ہے اور اسے ماقبل یا مابعد کے اشعار سے کوئی معنوی تعلق نہیں ہوتا۔ اردو اور فارسی میں ایسی غزلیں بھی ملتی ہیں جن میں وحدتِ مضمون ہے۔ لیکن یہ مستثنیات ہیں۔ عام طور پر غزل کے ہر شعر کا مضمون الگ ہوتا ہے۔ اس لیے غزل کی وحدت محض ہیئتی وحدت ہے، جو اسکے وزن، قافیہ، اور ردیف کی یگانگت سے پیدا ہوتی ہے۔

بادی النظر میں معلوم ہوتا ہے کہ غزل کی سب سے بڑی کمزوری یہی پریشان نویسی ہے، اور اسی بنا پر دورِ جدید کے چند نقادوں نے

اسے شدت سے ہدف ملامت بنایا ہے، لیکن اس تحقیر و تذلیل میں وہ حق بجانب نظر نہیں آتے۔ در حقیقت وہ قوانین و ضوابط، جن سے ہم کسی صنف کا جائزہ لیتے ہیں، خود اس صنف میں مضمر ہوتے ہیں، اور از روے انصاف انہیں صرف انہیں قواعد سے جانچا جا سکتا ہے۔ ایک نقاد کا قول ہے کہ کسی فنی تخلیق کا جائزہ لیتے وقت ہمیں اپنے آپ سے دو سوال پوچھنے چاہییں (۱) فن کار کا کیا مقصد تھا اور (۲) وہ اسکے حصول میں کہاں تک کامیاب ہوا ہے۔ ان پر ایک اور ضروری سوال کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ آیا وہ عمل اس قابل بھی تھا کہ اسے کیا جائے۔

ادبی سلسلۂ مدارج میں غزل کو وہ مقام حاصل نہیں جو رزمیہ یا المیہ یا دیگر بلند مرتبت اصناف کو حاصل ہے، لیکن جہاں تک پریشان نویسی کا تعلق ہے، وہ اسکی فطرت کا جزو ہے، اسلیے محض اس بنا پر اسے موردِ الزام نہیں بنایا جا سکتا۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس خود عاید کردہ پابندی میں اسے کتنی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔

غزل کی سب سے بڑی خوبی ایجاز و اختصار ہے، اور اس خوبی کا براہ راست اسکی پریشان نویسی سے تعلق ہے۔ شاعر خوب جانتا ہے کہ اسکا میدان عمل بہت محدود ہے، اسلیے غزل میں حشو و زوائد اور غیر ضروری تفصیلات کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکابر شعراء نے بڑے وسیع اور گہرے مطالب کو فقط ایک شعر میں سمو دیا ہے۔ اسمیں شک نہیں کہ بعض اوقات شعراء اس مختصر نویسی میں کامیاب نہیں ہوے، اور ان کے کلام میں ابہام پیدا ہو گیا ہے، لیکن جب کبھی وہ اپنے مطالب کو غزل کی مختصر حدود میں بند کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں تو شعر ایک معجزہ بن گیا ہے۔

غزل پر شدیدترین الزام یہ عاید کیا جاتا ہے کہ اسمیں شاعر اپنے خیالات کا اظہار نہیں کر سکتا۔ اس میں وہی کچھ کہا جا سکتا ہے جسکی قافیہ اور ردیف اجازت دیتے ہیں، اور وہ الفاظ کا سہارا لیتے ہوے آخر کار ایک مطلب تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس میں ذرا شک نہیں کہ ادنلی قسم کے شعراء کا یہی شیوہ ہے، اور میں تو یہ محسوس کرتا ہوں کہ متشاعر معترضین اس تنقید میں اپنی ناکامیوں یا مشکلات کی سرگذشت بیان کر رہے ہیں، لیکن حقیقی شعراء قافیہ کی مدد سے خیال کی جستجو میں سرگرداں نہیں پھرتے، بلکہ قافیہ کی مدد سے معاً ایک مکمل خیال ان کے سامنے آ جاتا ہے۔

باقی رہا قافیہ کا خیال کی طرف رہنمائی کرنا تو اسمیں کوئی قباحت نہیں۔ علاوہ ازیں یہ تنقید صرف غزل گو شعراء پر ہی نہیں بلکہ تمام شعراء پر صادق آتی ہے۔ انگریزی شاعر ڈرائی ڈن نے لکھا ہے کہ قافیہ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اسکی مدد سے شاعر کا دماغ ایک خاص خیال کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔ نفسیات کے ماہر اس بات پر متفق ہیں کہ کوئی خیال خود بخود ہمارے شعور میں نہیں آ سکتا۔ اسے کسی نہ کسی ایتلاف کی ضرورت ہے، خواہ وہ مرئی و یا غیر مرئی۔ پس قافیہ کی خوبی یہ ہے کہ اسکی مدد سے ایک پورے کا پورا خیال شاعر کے سامنے آ جاتا ہے۔ اس لئے یہ کہنا، کہ صرف غزل گو شاعر قافیہ کے دست نگر ہیں، درست نہیں۔ در حقیقت شعراء کو خیال قافیہ ہی کی مدد سے سوجھتے ہیں، اور یہ ایک عالمگیر حقیقت ہے۔ غالباً اس نظریہ کا آغاز بدیں وجہ ہوا ہوگا کہ نظم کہتے وقت شاعر ایک خاص مضمون پر شعر کہنے کے ارادہ سے آغاز کلام کرتا ہے، اور غزل گو شعراء کے پیش نظر کوئی خاص مضمون نہیں ہوتا، لیکن اگر

کسی نظم کا تجزیہ کیا جائے، تو اس حقیقت کا مکمل انکشاف ہوتا ہے کہ غزل کی طرح وہاں بھی تلازمہ کا وہی ناگزیر قانون جاری ہے۔

پہلے پہل غزل صرف عشقیہ مضامین کے لئے مخصوص تھی۔ آہستہ آہستہ جب اسکی مقبولیت میں اضافہ ہوتا چلا گیا تو اسمیں سب طرح کے مضمون داخل ہونا شروع ہوگیے۔ آجکل غزل مضامین مختلفہ کا ایک گلدستہ ہے، جسمیں تصوف، الٰہیات، اخلاقیات، طنز و استہزا، سیاست۔ سب کے لیے جگہ ہے۔ یہ وسعت غزل کے مخصوص عشقیہ تلمیحات کے ''علامتی،، استعمال سے پیدا ہوتی ہے۔ غزل کے مضمون خواہ کتنے ہی ٹھوس، فلسفیانہ اور عالمانہ کیوں نہ ہوں، لیکن اسمیں کام و دہن کی تسکین کا سامان بالعموم موجود ہوتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں مضامین کی بوقلمونی کے علاوہ اسمیں عشق کی چاشنی اور حسن کی دلآویزی اکثر پائی جاتی ہے۔

اوپر کے تمام حملے غزل پر فنی اعتبار سے کئے گیے ہیں۔ اس پر سب سے بڑا وار یہ کیا گیا ہے کہ وہ مخرب اخلاق ہے۔ غزل پر یہ حملہ اس وقت ہوا جب مغربی اثرات کے زیرِ عمل ہمارے دل و دماغ میں پرانے ادب اور پرانی تہذیب کے خلاف ایک شدید رد عمل ہو رہا تھا، اور ہمیں یہ تلقین کی جارہی تھی کہ ہم حسن و عشق کی مسموم فضا سے نکل کر ''ترقی،، کی راہ پر گامزن ہوں۔ یہ ایک نہایت معقول فیصلہ تھا، کیونکہ اس وقت ہم حسن و عشق کے جمیل خیابان میں کچھ ایسے کھوئے ہوے تھے کہ ہم دنیا و ما فیہا سے بالکل بے خبر ہوگیے تھے، لیکن سوچنے کی بات ہے کہ کیا **مسدس حالی** **دیوان غالب** کا جواب ہو سکتی ہے؟ یا دوسرے الفاظ میں، کیا **مسدس حالی** سے مستفید ہوکر ہمیں **دیوان غالب** کی ضرورت نہیں رہتی؟

حضرت عیسیٰؑ کا قول ہے کہ میرے باپ کے محل کی بہت سی منزلیں ہیں - یہی حال ہماری زندگی کا بھی ہے ، اسکے بھی بہت سے پہلو ہیں ، اور وہ صرف اسی وقت معراجِ کمال پر پہنچتی ہے جب اسکے مختلف اور متخالف رجحانات اور تقاضوں کی تسکین اور آبیاری ہوتی رہے - اگر کسی چیز کی امنگ یا جستجو ہماری طبیعت میں ودیعت کی گئی ہے ، تو اسے رائے عامہ یا قانون کے تازیانہ سے دبایا تو جا سکتا ہے ، لیکن اسے نکال پھینکنا ممکن نہیں - یہی سبب ہے کہ متخاصمین کی بے حد مخالفت کے باوجود غزل اب تک زندہ ہے -

غزل کی کہانی قصیدہ سے ملتی جلتی ہے - مرور وقت کے ساتھ اسمیں بھی تصنع اور مبالغہ دخیل ہوگئے - صورت پرستی نے معانی کی جگہ لے لی اور غزل الفاظ اور پیچیدہ خیالات کا گورکھ دھندا بن کر رہ گئی - پہلے تو غزل کی طوالت میں اضافہ ہوا ، اور دو غزلے ، سہ غزلے اور چہار غزلے لکھے گئے - اسکے بعد مشکل اور انمیل ردیف اور قافیہ کے غیرموزوں استعمال سے غزل نیم جان ہوگئی - لکھنئو میں عریاں نویسی کا دستور ہوا اور جواں شاعر خوب کھل کھیلے - ہمارے شعراء کی بیشتر غزلیں جسد بے جاں ہیں - جنہیں حسین ملبوسات سے دیدہ زیب بنانے کی کوشش کی گئی ہے ، لیکن ان میں جذبات کی روح نہیں -

حال میں غزل کی راکھ سے پھر شعلہ بلند ہوا ہے اور دورِ حاضرہ کی زندگی کی ترجمانی میں وہ اچھا خاصا حصہ لے رہی ہے - قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ غزل آجکل ایک نشأۃ ثانیہ سے گذر رہی ہے -

مثنوی: وزن، قافیه، ردیف اور دیگر لوازمات شاعری سے شاعر اپنے اوپر پابندیاں عاید کرتا ہے۔ یہ پابندیاں اس لیے مستحسن ہیں کہ ان کی وجہ سے کلام کے حسن اور تاثیر میں اضافہ ہوتا ہے۔ غنائیہ شاعری کی شدید تأثر آفرینی کا راز انہیں دلکش پابندیوں میں مضمر ہے، لیکن ایک طویل نظم میں بعض آرائشی پابندیوں سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرنا اظہار مطلب کی راہ میں روڑے اٹکانے کے مترادف ہے۔ یہاں صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ شاعر اپنی تخلیقی قوت پر غیر ضروری زور ڈالے بغیر شعر کہتا چلا جائے۔ اسی اصول کے پیشِ نظر مغرب میں نظمِ معرّا کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں نظمِ معرّا نہیں، اس لیے قصے کہانیوں یا طویل مطالب کے اظہار کے لیے مثنوی کا استعمال ہوتا ہے۔ مثنوی کے لغوی معنی ''دو دو کیا گیا،، کے ہیں۔ اس سے مراد وہ نظم ہے جس کی ہر بیت کا قافیہ جدا جدا اور دو مصرعوں کا قافیہ متفق ہو۔ مثنوی کی خوبی یہ ہے کہ اسکے اشعار ہموار ہوں اور زبان میں روانی اور قافیوں میں قدرتی ربط ہو۔

اگر دکنی مثنویوں کو نظر انداز کر دیا جائے (جنکی ادبی وقعت ابھی تک معین نہیں ہوئی) تو ہماری کامیاب مثنویوں کو ایک ہاتھ کی انگلیوں پر گنا جا سکتا ہے، ان میں میر اثر کی مثنوی خواب و خیال، میر تقی کی دو مثنویاں، گھر کا حال اور مثنوی نرسنگ نامہ اور مثنوی سحرالبیان، سب اپنی اپنی جگہ قابلِ ستائش ہیں۔ دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کی شہرت اس کے صنائع و بدائع کی طرفہ کاری کی وجہ سے ہے، اور نواب مرزا شوق لکھنئوی کی مثنویوں میں صرف سلیس اور با محاورہ زبان ان کی افسانوی بے مایگی کی پردہ پوشی کرتی ہے۔

نظمِ آزاد

غدر کے جلد ہی بعد ایک حیاتِ تازہ ہندوستانیوں کے رگ و پے میں دوڑنے لگی - اس نقطۂ نظر سے علی گڑھ تحریک ماضی اور حال کے درمیان ایک حد فاصل کے مانند ہے، لیکن باوجود اس تبدیلی کے نئی زندگی پرانے ادبی سانچوں میں ڈھلتی رہی - ہیئتی تجربات کی پہلی واضح مثالیں **اقبال** کے پیام مشرق میں ملتی ہیں - **حفیظ** کی غنایہ دراصل انہیں تجربات کی مرہونِ منت ہے، لیکن اسکے ساتھ ہی یہ بھی ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مؤخرالذکر نے ان غنائی پیراؤں میں لچک اور وسعت پیدا کر کے جدید اردو ادب میں اپنے لیے ایک مستقل مقام پیدا کر لیا ہے -

ہیئتی تبدیلی کی طرف دوسرا قدم **خالد** نے اٹھایا، جسنے اپنے قیامِ انگلستان کے دوران میں انگریزی نظم آزاد کی دیکھا دیکھی نظمیں لکھنا شروع کیں -

آیے اب دیکھیں کہ نظمِ آزاد کسے کہتے ہیں اور اسکی امتیازی خصوصیات کیا ہیں -

سب سے پہلے ہمیں یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہماری آزاد نظم انگریزی کی نظمِ آزاد سے بہت مختلف ہے - انگریزی کی نظمِ آزاد عام طور پر وزن سے مستغنی ہے - اس میں وزن تو ہے، لیکن اسے باقاعدگی سے استعمال نہیں کیا جاتا - جس طرح ایک تیراک کبھی پانی کی سطح پر آتا ہے اور پھر جب چاہے غوطہ لگا کر غائب ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح انگریز شاعر تھوڑی دیر کے لیے

موزون زبان استعمال کرتا ہے، اور پھر دیکھتے دیکھتے نثر لکھنی شروع کر دیتا ہے۔ اور یہ تبدیلیاں سراسر ذوقِ سلیم کے ماتحت کی جاتی ہیں۔ ان کے لیے کوئی متعین قوانین نہیں، اگر نظم صحیح معنوں میں آزاد ہو تو وہ قوانین کی کیسے متحمل ہو سکتی ہے؟ اسکے برعکس اردو میں وزن کا بالالتزام اہتمام کیا جاتا ہے، لیکن مصرعوں یا پاروں کی ساخت میں شاعر کسی واضح نمونے کی پیروی نہیں کرتا۔ ان کا انحصار سراسر وجدانیات پر ہے۔ قافیہ کے معاملہ میں بھی اردو شاعر آزاد ہے۔ جہاں چاہے اسکا استعمال کرے جہاں چاہے نہ کرے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ ہماری نظمِ آزاد، انگریزی کی بے قاعدہ غنایہ (Irregular lyric) سے مشابہت رکھتی ہے۔

پابند اور آزاد لکھنے والوں میں یہ فرق ہے کہ اول الذکر اپنے احساسات اور خیالات کو بندھے بندھائے یا متعین اوزانی سانچوں میں ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں ان کے ہاں ہیئت کو خیالات پر تقدم حاصل ہے، اور مؤخرالذکر کو اول الذکر کی پابندی کرنی پڑتی ہے۔ جیسا کہ اکثر خیال کیا جاتا ہے، نظمِ آزاد میں معاملہ اسکے بر عکس نہیں۔ بلکہ وہاں ہیئت کی صورت گری اظہارِ خیال کے ساتھ ساتھ ہوتی چلی جاتی ہے۔ اور خود شاعر کو اس بات کا علم نہیں ہوتا کہ اسکا خیال آخرکار کیا شکل اختیار کریگا۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہ ہوگا، کہ پابند نظم کے مقابلہ میں نظمِ آزاد آسان ہے۔ بلکہ حقیقت اسکے برعکس ہے۔ پابند شاعر ایک خاص ہیئت کا سہارا لیتا ہے۔ اسکی تخلیق اسکا کام نہیں، بلکہ اپنے تمام جمالیاتی خصائص کے ساتھ وہ اسے بنی بنائی مل جاتی ہے۔ برعکس

اسکے آزاد شعراء کو ایک ایسی لچکدار ہیئت تیار کرنی پڑتی ہے جو ان کے قامتِ خیال پر پوری اترے، اور چونکہ ہر جذبہ اپنی تاثراتی بوقلمونی اور وسعت میں ایک جداگانہ حیثیت رکھتا ہے، اسلیے شاعر کو ایک ایسی ہیئت تخلیق کرنی پڑتی ہے جو اسکے خیالات اور احساسات سے فطری مناسبت رکھتی ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ نظمِ آزاد کے محرکات میں محض نیا پن یا نرالا پن یا آساں نویسی کو بہت کم دخل ہے، اور نہ ہی یہ بالکل نئی چیز ہے۔ تجزیہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچتی ہے کہ اسکی تخلیق پابند شاعری کے تار و پود سے ہوتی ہے۔ ہاں اس کے استعمال میں تصرف سے کام لیا گیا ہے جسکی وجہ سے اسکی ظاہری شکل نرالی دکھائی دیتی ہے۔

قافیہ شعر کا، خصوصاً غنایہ شاعری کا، زیور ہے۔ آزاد شعراء کا نقطۂ نظر اسکی بابت ایک سا نہیں ہے۔ بعض نے اسے رد کر دیا ہے۔ دوسروں نے اسکے عمل میں تبدیلی کر دی ہے؛ مثلاً خالد کے ہاں نظم کے آخری دو مصرعے کبھی کبھی ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ اسکے علاوہ اگرچہ وہ منتہائی قافیے بہت کم استعمال کرتا ہے لیکن اسے وسطی قافیہ کا شوق ہے۔ چنانچہ آزاد نظم میں گاہ بگاہ قافیہ پسندی کی بھی تسکیں ہوتی رہتی ہے۔ مثال کے طور پر ذیل کی نظم ملاحظہ ہو۔

بوڑھا درخت

طوفان آئیں، طوفان جائیں،
پربت کی خاموش تنہائیوں میں
سینے کو تانے،

سب جھیلتا ہوں ،
سالوں کے آہستہ آہستہ چرکے ،
فطرت کے بے رحم ہاتھوں کے حملے ،
پتوں کے جھومر ، پھولوں کے گہنے ،
میں نے بھی پہنے ،
تیری نگاہوں میں ، میری بہارں کی
رُت چھا رہی ہے
میری نگاہوں نے وہ رُت بھی دیکھی
یہ رُت بھی دیکھی ،
پتوں کے بادل چھائے ہوئے تھے ،
میں کھو چکا تھا ، گم ہو گیا تھا ،
اب میں ہی میں ہوں ،
اک تیر بنکر آکاش کی سمت اُڑنے لگا ہوں ،

خالد

نظمِ آزاد آجکل بہت مقبول ہے ، اور بہت سے شعراء نے اس صنفِ سخن میں کامیابی حاصل کی ہے ، لیکن جس خوبصورتی اور آزادی سے اسے خالد اور میرا جی نے استعمال کیا ہے وہ انہیں کا حصہ ہے ۔

محمدؐ صادق

انتخاب

ولی

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کوں جلاتی جا
ٹک مہر کے پانی سوں توں آگ بجھاتی جا

تجھ چال کو قیمت سوں دل نہیں ہے مرا واقف
اے مان بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں
ٹک پانی کے جھانجھر کی جھنکار سناتی جا

مجھ دل کے کبوتر کو پکڑا ہے تیری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اسکو چھڑاتی جا

تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر میری ساری
اے بت کی پجن ہاری، ٹک اس کو بچاتی جا

تجھ نیہ میں دل جل جل جوگی کی لیا صورت
یک بار اسے موھن چھاتی سوں لگاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے **ولی** دائم
مشتاق درس کا ہے ٹک درس دکھاتی جا

سجن تم مکھ ستی کھولو نقاب آھستہ آھستہ
کہ جیون گل سوں نکستا ہے گلاب آھستہ آھستہ

ہزاراں لاکھ خوباں میں سجن میرا چلے یوں کر
ستاروں میں چلے جیوں مہتاب آھستہ آھستہ

سلونے سانورے پیتم تیری موتی کی جھلکاں نے
کیا عقد ثریا کوں خراب آھستہ آھستہ

نہ بوجھو خود بخود موہن میں اڑ ہے
رقیب رو سیہ فتنہ کی جڑ ہے
ہر اک زلفاں کے دیکھے نہیں اٹکتا
اٹکتا ہوں جہاں دل کی پکڑ ہے
کروں کیوں سنگ دل کے دل کوں تسخیر
زبردستی میں بیجا پر کا گڑ ہے
نہیں بل دار چیرا سر پر اس کے
عزیزاں ! یو جوانی کی اکڑ ہے
برستا ہے سجن کے مکھ اپر نور
نگاہوں کی ہر ایک جانب سوں جھڑ ہے
کسی کی بات پر رکھتا نہیں گوش
ہٹیلے ہٹ بھرے میں سخت اڑ ہے
ولی توں بحر معنی کا ہے غواص
ہر ایک مصرع ترا موتیاں کی لڑ ہے

اس کوں حاصل کیونکے ہو جگ میں فراغ زندگی
گردش افلاک ہے جسکوں ایاغ زندگی
بے عزیزاں سیر گلشن ہے گل داغ الم
صحبت احباب ہے معنی میں باغ زندگی
آسماں میری نظر میں کلبۂ تاریک ہے
گر نہ دیکھوں تجھ کوں اے چشم و چراغ زندگی
لالہ خونیں کفن کے حال سوں ظاہر ہوا
بستگی ہے خال سوں خوباں کے داغ زندگی
کیوں نہ ہووے اے ولی روشن شب قدر حیات
ہے نگاہ گرم گل رویاں چراغ زندگی

سودا

جوش طوفاں دیدۂ نمناک سے کیا کیا ہوا
دیکھ لے دنیا میں مشت خاک سے کیا کیا ہوا

جو تجھے دیکھے کہے حور و ملک، شمش و قمر
حسن تیرا دور تر ادراک سے کیا کیا ہوا

پر تجلی شہرہ آفاق جلوہ حسن کا
عشق بازوں کی نگاہ پاک سے کیا کیا ہوا

قیس اور فرہاد و وامق پر جو گذرا سو سنا
مجھ پہ دیکھو اس بت بے باک سے کیا کیا ہوا

جوشش دریاے خوں ہنگامہ شور و فغاں
دیدہ تر، سینہ صد چاک سے کیا کیا ہوا

دور ساغر تھا ابھی یا ہے ابھی چشم پر آب
دیکھ **سودا** گردش افلاک سے کیا کیا ہوا

جاتے ہیں لوگ قافلہ کے پیش و پس چلے
دنیا عجب سرا ہے جہاں آ کے بس چلے

کہیو صبا سلام ہمارا بہار سے
ہم تو چمن کو چھوڑ کے سوے قفس چلے

اے غنچہ آنکھ کھول کے ٹک تو چمن کو دیکھ
جمعیّت دلی پہ تیری پھول ہنس چلے

تیرے سخن کو میں بسر و چشم ناصحا
مانوں ہزار بار اگر دل سے بس چلے

صیاد اب تو کیجیے قفس سے ہمیں رہا
ظالم پھڑک کے پر و بال گھس چلے

کام اس گلی میں سر سے یہ **سودا** گزر چکا
کیا تاب اک قدم جو ادھر بوالہوس چلے

کسی کا درد دل پیارے تمہارا ناز کیا سمجھے
جو گذرے صید کے دل پر اسے شہباز کیا سمجھے
رہا کرنا ہمیں صیاد اب پامال کرنا ہے
پھڑکنا بھی جسے بھولا ہو سو پرواز کیا سمجھے
نہ پہنچے داد کو ہرگز تیرے کوچے کا فریادی
کسی کے شور محشر میں کوئی آواز کیا سمجھے
کہا چاہے تھا کچھ تجھسے و لیکن دل دھڑکتا ہے
کہ میری بات کے ڈھب کو تو اے طناز کیا سمجھے
جو گذری رات میرے پر کسے معلوم ہو تجھ بن
دل پروانہ کا جز شمع کوئی راز کیا سمجھے
نہ پڑھیو یہ غزل **سودا** تو ہرگز **میر** کے آگے
وہ ان طرزوں سے کیا واقف وہ یہ انداز کیا سمجھے

نسیم ہے تیرے کوچے میں اور صبا بھی ہے
ہماری خاک سے دیکھو تو کچھ رہا بھی ہے
ترا غرور میرا عجز تا کجا ظالم
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے
جلے ہے شمع سے پروانہ اور میں تجھسے
کہیں ہے مہر بھی جگ میں کہیں وفا بھی ہے
ستم روا ہے اسیروں پہ اس قدر صیاد
چمن چمن کہیں بلبل کی اب نوا بھی ہے
سمجھ کے رکھیو قدم دشت خار میں مجنوں
کہ اس نواح میں **سودا** برہنہ پا بھی ہے

غیر کے پاس یہ اپنا ھی گماں ھے کہ نہیں
جلوہ گر یار میرا ورنہ کہاں ھے کہ نہیں
مہر ہر ذرہ میں مجھ کو ھی نظر آتا ھے
تم بھی ٹک دیکھوتو صاحب نظراں ھے کہ نہیں
پاس ناموس مجھے عشق کا ھے اے بلبل
ورنہ یاں کون سا انداز فغاں ھے کہ نہیں
دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ھوں
کچھ علاج انکا بھی اے شیشہ گراں ھے کہ نہیں
جرم ھے اسکی جفا کا کہ وفا کی تقصیر
کوئی تو بولو میاں منہ میں زباں ھے کہ نہیں

قطعہ

پوچھا اک روز میں **سودا** کہ اے آوارہ
تیرے رہنے کا معین بھی مکاں ھے کہ نہیں
یک بیک ھو کے برآشفتہ لگا یوں کہنے
کچھ تجھے عقل سے بہرہ بھی یہاں ھے کہ نہیں
دیکھا میں قصر فریدوں کے در اوپر اک شخص
حلقہ زن ھو کے پکارا کوئی یاں ھے کہ نہیں

میر

دل سے شوق رخ نکو نہ گیا
جھانکنا تاکنا کبھو نہ گیا
ہر قدم پر تھی اس کی منزل لیک
سر سے سودائے جستجو نہ گیا
سب گئے ہوش و صبر و تاب و تواں
لیکن اے داغ! دل سے تو نہ گیا

دل میں کتنے مسودے تھے ولے
ایک پیش اس کے روبرو نہ گیا
سبحہ گرداں ہی میر ہم تو رہے
دست کوتاہ تا سبو نہ گیا

اے دوست کوئی مجھ سا رسوا نہ ہوا ہوگا
دشمن کے بھی دشمن پر ایسا نہ ہوا ہوگا
ٹک گور غریباں کی کر سیر کہ دنیا میں
ان ظلم رسیدوں پر کیا کیا نہ ہوا ہوگا
ہے قاعدۂ کلی یہ کوے محبت میں
دل گم جو ہوا ہوگا پیدا نہ ہوا ہوگا
اس کہنہ خرابے میں آبادی نہ کر منعم
اک شہر نہیں یاں جو صحرا نہ ہوا ہوگا
آنکھوں سے تیری ہمکو ہے چشم کہ اب ہووے
جو فتنہ کہ دنیا میں برپا نہ ہوا ہوگا
جز مرتبہ کل کو حاصل کرے ہے آخر
اک قطرہ نہ دیکھا جو دریا نہ ہوا ہوگا
صد نشتر مژگاں کے لگنے سے نہ نکلا خوں
آگے تجھے میر ایسا سودا نہ ہوا ہوگا

تا بمقدور انتظار کیا دل نے اب زور بے قرار کیا
یہ توہم کا کارخانہ ہے یاں وہی ہے جو اعتبار کیا
ہم فقیروں سے بے ادائی کیا آن بیٹھے جو تمنے پیار کیا
سخت کافر تھا جس نے پہلے میر
مذہب عشق اختیار کیا

دل جو زیر غبار اکثر تھا　　کچھ مزاج ان دنوں مکدر تھا
سرسری تم جہان سے گذرے　　ورنہ ہر جا جہان دیگر تھا
اب خرابا ہوا جہان آباد　　ورنہ ہر اک قدم پہ یاں گھر تھا
بے زری کا نہ کر گلا غافل　　رکھ تسلی کہ یوں مقدر تھا
اتنے منعم جہان میں گذرے　　وقت رحلت کے کس کنے زر تھا
صاحب جاہ و شوکت و اقبال　　اک ازاں جملہ اب سکندر تھا
تھی یہ سب کائنات زیر نگیں　　ساتھ مور و ملخ سا لشکر تھا
لعل و یاقوت ہم زر و گوہر　　چاہیے جسقدر میسر تھا
آخر کار جب جہاں سے چلا　　ہاتھ خالی کفن سے باہر تھا
خوش رہا جب تلک رہا جیتا　　میر معلوم ہے قلندر تھا

بود نقش و نگار سا ہے کچھ　　صورت اک اعتبار سا ہے کچھ
یہ جو مہلت جسے کہیں ہیں عمر　　دیکھو تو انتظار سا ہے کچھ
مونہ نہ ہم جبریوں کے کھلواؤ　　کہنے تو اختیار سا ہے کچھ
ضعف پیری میں زندگانی بھی　　دوش پر اپنے بار سا ہے کچھ
کیا ہے دیکھو ہو جو ادھر ہر دم　　اور چتون میں پیار سا ہے کچھ
جیسے عنقا کہاں ہیں ہم اے میر　　شہروں میں اشتہار سا ہے کچھ

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اسپہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا
آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا
زندانمیں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

ہر زخم جگر داور محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تیری بیدادگری کا

اپنی تو جہاں آنکھ لگی پھر وہی دیکھو
آئینے کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

صد موسم گل ہم کو تہ بال ہی گزرے
مقدور نہ دیکھا کبھی بے بال و پری کا

ٹک **میر** جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

قدر رکھتی نہ تھی متاع دل
سارے عالم کو میں دکھا لایا

دل کہ یک قطرہ خوں نہیں ہے بیش
ایک عالم کے سر بلا لایا

لب پہ جس بار نے گرانی کی
اسکو یہ ناتواں اٹھا لایا

دل مجھے اس گلی میں لے جا کر
اور بھی خاک میں ملا لایا

ابتدا ہی میں مر گئے سب یار
عشق کی کون انتہا لایا

اب تو جاتے ہیں بت کدہ سے **میر**
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

اے حب جاہ والو جو آج تاجور ہے
کل اسکو دیکھیو تم نے تاج ہے نہ سر ہے

اے ہم صفیر بے گل کس کو دماغ نالہ
مدت ہوئی ہماری منقار زیر پر ہے

شمع اخیر شب ہوں سن سرگذشت میری
پھر صبح ہونے تک تو قصہ ہی مختصر ہے

اب رحم پر اسی کے موقوف ہے کہ یاں تو
نے اشک میں سرایت، نے آہ میں اثر ہے

ہر دم قدم کو اپنے رکھ احتیاط سے یاں
یہ کارگاہ ساری دکان شیشۂ گر ہے

آفت‌رسیدہ ہم کیا سر کھینچیں اس چمن میں
جوں نخل خشک ہمکو نے سایہ نے ثمر ہے

رہی نہ گفتہ میرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

برنگ صوت جرس تجھ سے دور ہوں تنہا
خبر نہیں ہے تجھے آہ کارواں میری

ترے نہ آج کے آنے میں صبح کے مجھ پاس
ہزار جائے گئی طبع بدگماں میری

شب اس کے کوچہ میں جاتا ہوں اس توقع پر
کہ ایک دوست ہے واں خواب پاسباں میری

اسی سے دور رہا اصل مدعا جو تھا
گئی یہ عمر عزیز آہ رائگاں میری

ترے فراق میں جیسے خیال مفلس کا
گئی ہے فکر پریشاں کہاں کہاں میری

رھا میں در پس دیوار باغ مدت لیک
گئی گلوں کے نه کانوں تلک فغاں میری

دیا دکھائی مجھے تو اسی کا جلوہ **میر**
پڑی جہاں میں جاکر نظر جہاں میری

میر درد

ھرچند تیری سمت سوا راہ ھی نہیں
تسپر بھی آہ یاں کوئی آگاہ ھی نہیں

وہ مرتبه ھی اور ھے فہمید کے پرے
ھم جسکو بوجھتے ھیں وہ اللہ ھی نہیں

ھم بھی فلک سے کرتے کسی چیز کی طلب
ڈھونڈا پر اپنے دلمیں تو کچھ چاہ ھی نہیں

انساں کی ذات سے ھیں خدائی کے کھیل یاں
بازی کہاں بساط پہ گر شاہ ھی نہیں

سو رنگ سے ھیں جلوہ نما گو بتان خلق
اپنا ترے سوا کوئی دلخواہ ھی نہیں

گر کہتے ھو کہ ھے وھی ھادی وھی مضل
تو راہ پر ھیں سب کوئی گمراہ ھی نہیں

اے **درد** مثل آئینه ڈھونڈ اسکو آپ میں
بیروں در تو اپنی قدم‌گاہ ھی نہیں

ھستی ھے جب تک ھم ھیں اسی اضطراب میں
جوں موج آپھنسے ھیں عجب پیچ و تاب میں

نے خانہ خدا ہے نہ ہے یہ بتوں کا گھر
رھتا ہے کون اس دل خانہ خراب میں
آئینہ عدم ھی میں ھستی ہے جلوہ گر
ہے موجزن تمام یہ دریا حباب میں
غافل جہاں کی دید کو مفت نظر سمجھ
پھر دیکھنا نہیں ہے اس عالم کو خواب میں
ھر جزو، کل کے ساتھ بمعنی ہے اتصال
دریا سے دُر جدا ہے پہ ہے غرق آب میں
میں اور درد مجھ سے خریداری بتاں
ہے ایک دل بساط میں سو کس حساب میں

باغ جہاں کے گل ھیں یا خار ھیں تو ھم ھیں
گر یار ہے تو ھم ھیں اغیار ھیں تو ھم ھیں
دریائے معرفت کے دیکھا تو ھم ھیں ساحل
گر وار ھیں تو ھم ھیں ور پار ھیں تو ھم ھیں
وابستہ ہے ھمیں سے گر جبر ہے وگر قدر
مجبور ھیں تو ھم ھیں مختار ھیں تو ھم ھیں
تیرا ھی حسن جگ میں ھر چند موجزن ہے
تسپر بھی تشنہ کام دیدار ھیں تو ھم ھیں
الفاظ خلق ھم بن سب مہملات سے تھے
معنی کی طرح ربط گفتار ھیں تو ھم ھیں
اوروں سے تو گرانی یک لخت اٹھ گئی تھی
اے درد اپنے دل کے گر بار ھیں تو ھم ھیں

جمع میں افراد عالم ایک ھس
گل کے سب اوراق برھم ایک ھیں

هووے کب وحدت میں کثرت سے خلل
جسم و جاں گو دو ھیں پر ھم ایک ھس

نوع انساں کی بزرگی سے ٹک ایک
حضرت جبرئیل محرم ایک ھیں

دال ھے اسپر بھی قراں کا وجود
بات کی فہمید میں ھم ایک ھیں

متفق آپس میں ھیں اھل شہود
درد آنکھیں دیکھ باھم ایک ھیں

فرصت زندگی بہت کم ھے
مغتنم ھے یه دید جو دم ھے

گو سراپا ھے آب آئینه
اپنی آنکھوں میں چشم بے نم ھے

دل صد چاک ھے گل خنداں
شادی و غم جہاں میں توام ھے

دین و دنیا میں تو ھی ظاھر ھے
دونوں عالم کا ایک عالم ھے

خیر و شر کو سمجھ که ھیں دو زھر
سانپ کی زیست ھے تجھے سم ھے

مت عبادت په پھولیے زاھد
سب طفیل گناه آدم ھے

سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف
جسکے ہاتھ آئے جام سو جم ہے

اپنے نزدیک باغ میں تجھ بن
جو شجر ہے سو نخل ماتم ہے

نہ ملیں گے اگر کہیگا تو
تیری خاطر ہمیں مقدم ہے

دل عاشق کی بے قراری کو
وہ ہی سمجھے ہے جو کہ محرم ہے

درد کا حال کچھ نہ پوچھو تم
وہ ہی رونا ہے نت وہی غم ہے

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے

زندگی ہے یا کوئی طوفاں ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

کیا ہمیں کام ان گلوں سے اے صبا
ایک دم آئے ادھر اودھر چلے

شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشم تر آئے تھے دامن تر چلے

ڈھونڈتے ہیں آپ سے اسکو پرے
شیخ صاحب چھوڑ گھر باہر چلے

ہم نہ جانے پائے باہر آپ سے
وہ ہی آڑے آ گیا جیدھر چلے

هم جہاں میں آئے تھے تنہا ولے
ساتھ اپنے اب اسے لیکر چلے

ساقیا یاں چل رہا ہے چل چلاؤ
جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

انشا

چھیڑنے کا تو مزہ تب ہے کہو اور سنو
بات میں تم تو خفا ہوگئے لو اور سنو

تم کہوگے جسے کچھ کیوں نہ کہے گا تم کو
چھوڑ دیوے گا بھلا دیکھ تو لو اور سنو

یہی انصاف ہے کچھ سوچو تو دل میں اپنے
تم تو سو کہہ لو مری اک نہ سنو اور سنو

آپ ہی آپ مجھے چھیڑو رکو پھر آپ ہی
آپ ہی بات میں پھر روٹھ اٹھو اور سنو

آفریں تم پہ یہی چاہیے شاباش تمہیں
دیکھ روتا مجھے یوں ہسنے لگو اور سنو

بات میری نہیں سنتے جو اکیلے مل گئے
ایسے ہی ڈھب سے سناؤں کہ سنو اور سنو

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹھکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں
خیال ان کا پرے ہے عرش اعظم سے کہیں ساقی
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں
بسان نقش پاے رہرواں کوے تمنا میں
نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
یہ اپنی چال ہے افتادگی سے ان دنوں پہروں
نظر آیا جہاں پر سایۂ دیوار بیٹھے ہیں
کہیں ہیں صبر کس کو آہ ننگ و نام کیا شے ہے
غرض رو پیٹ کر ان سب کو ہم یکبار بیٹھے ہیں
نجیبوں کا عجب کچھ حال ہے اس دور میں یارو
جہاں پوچھو یہی کہتے ہیں ہم سب بیکار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا
غنیمت ہے کہ ہم صورت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

لب پہ آئی ہوئی یہ جان پھرے
یار گر اس طرف کو آن پھرے
چین کیا ہو ہمیں جب آٹھ پہر
اپنی آنکھوں میں وہ جوان پھرے
ہچکیاں لے ہے اس طرح بط مے
جس طرح گٹکری میں تان پھرے
یا تو وہ عہد تھے کہ ہم ہرگز
نہ پھریں گے اگر جہان پھرے

آئے اب روکھے ہو معاذاللہ
آپ سے شخص کی زبان پھرے
روٹھ کر اٹھ چلے تھے انشا سے
بارے پھر ہو کے مہربان پھرے

اشک مژگاں تر کی پونجی ہے
یہ ثمر اس شجر کی پونجی ہے
آہ کو مت حقیر جان یہی
دودماں اثر کی پونجی ہے
جو گھڑی یاد میں تری کٹ جائے
وہ ہی آٹھوں پہر کی پونجی ہے
جلوہ یار ہے عزیز بہت
یہی اہل نظر کی پونجی ہے
جلد اچھا ہو یہ تعالیٰ اللہ
یہی انشا کے گھر کی پونجی ہے
تیری بخشی ہوئی خداوندا
میرے یہ عمر بھر کی پونجی ہے

ناسخ

دل میں پوشیدہ تپ عشق بتاں رکھتے ہیں
آگ ہم سنگ کی مانند نہاں رکھتے ہیں
مثل پروانہ نہیں کچھ زر و مال اپنے پاس
ہم فقط تم پہ فدا کرنے کو جاں رکھتے ہیں

محفل یار میں کچھ بات نہ نکلی منھ سے
کہنے کو شمع کی مانند زباں رکھتے ہیں
ہو گیا زرد پڑی جس کی حسینوں پہ نظر
یہ عجب گل ہیں کہ تاثیر خزاں رکھتے ہیں
ہم عوض ملک جہاں ملک سخن اے ناسخ
گوں نہیں حکم رواں طبع رواں رکھتے ہیں

آتش

ہوائے دور مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے
گدا نواز کوئی شہ سوار راہ میں ہے
بلند آج نہایت غبار راہ میں ہے
عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر نہ کوئی دیار راہ میں ہے
طریق عشق میں اے دل عصا آہ ہے شرط
کہیں چڑھاؤ کسی جا اتار راہ میں ہے
نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایت پروردگار راہ میں ہے
نہ جائیں آپ ابھی دوپہر ہے گرمی کی
بہت سی گرد بہت سا غبار راہ میں ہے
تلاش یار میں کیا ڈھونڈھیے کسی کا ساتھ
ہمارا سایا ہمیں ناگوار راہ میں ہے
سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجر سایہ‌دار راہ میں ہے

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

پتہ یہ کوچہ قاتل کا سن رکھ اے قاصد
بجائے سنگ نشاں اک مزار راہ میں ہے

تھکیں جو پاؤں تو چل سر کے بل نہ ٹھیر **آتش**
گل مراد ہے منزل میں، خار راہ میں ہے

مگر اسکو فریب نرگس مستانہ آتا ہے
الٹتی ہیں صفیں گردش میں جب پیمانہ آتا ہے

خوشی سے اپنی رسوائی گوارا ہو نہیں سکتی
گریباں پھاڑتا ہے تنگ جب دیوانہ آتا ہے

فراق یار میں دل پر نہیں معلوم کیا گذری
جو اشک آنکھوں میں آتا ہے سو بےتابانہ آتا ہے

سمجھتے ہیں میرے دلکی وہ کیا نافہم و ناداں ہیں
حضور شمع بےمطلب نہیں پروانہ آتا ہے

طلب دنیا کی کر کے زن مریدی ہو نہیں سکتی
خیال آبروے ہمت مردانہ آتا ہے

ہمیشہ فکر سے یاں عاشقانہ شعر ڈھلتے ہیں
زباں کو اپنی بس اک حسن کا افسانہ آتا ہے

تماشاگاہ ہستی میں عدم کا دھیان ہے کس کو
کسے اس انجمن میں یاد خلوت خانہ آتا ہے

خدا کا گھر ہے، بت خانہ ہمارا دل نہیں **آتش**
مقام آشنا ہے یاں نہیں بیگانہ آتا ہے

عناب لب کا اپنے مزا کچھ نہ پوچھیے
کس درد کے ہیں آپ دوا کچھ نہ پوچھیے

ناز و نیاز عاشق و معشوق کیا کہوں
عجز و غرور شاہ و گدا کچھ نہ پوچھیے

کیا کیا نگاہ پھسلتی ہے رخسار یار پر
کیسا یہ آئینہ ہے صفا کچھ نہ پوچھیے

آئینہ لیکے کیجیے اپنا مشاہدہ
ہم سے سلوک شرم و حیا کچھ نہ پوچھیے

رنگیں کئے ہیں یار نے جب سے کہ دست و پا
کیا رنگ لا رہی ہے حنا کچھ نہ پوچھیے

ناگفتنی ہے عشق بتاں کا معاملہ
ہر حال میں ہے شکر خدا کچھ نہ پوچھیے

کوتاہ خال روے منور ہے کسقدر
کتنی ہے زلف یار رسا کچھ نہ پوچھیے

آتش گناہ عشق کی تعزیر کیا کہوں
مشفق جو کچھ ہے اسکی سزا کچھ نہ پوچھیے

جرأت

خالی اس سے جو ہم نے گھر دیکھا
ہر طرف آہ آہ بھر دیکھا

شمع ساں جس نے کی زباں دراز
اسکا قصہ ہی مختصر دیکھا

دم بدم یاں نیا ہی عالم ہے
خوب عالم کو غور کر دیکھا

اک نہ اک بات کا ہے سبکو فکر
اس سے خالی نہ اک بشر دیکھا

جس نے اس سادہ رو کو اپنے حضور
سادگی سے بھی بھر نظر دیکھا

دل میں کس کس طرح کا آیا جنوں
کیا یہ سمجھا تھا کیوں ادھر دیکھا

کیا کہیں کیا تیرے مریض کا حال
ہم نے اے شوخ بیخبر دیکھا

کل پرستار اسکے تھے جو لوگ
آج ان سب کو نوحہ گر دیکھا

پڑھ غزل اور بھی ایک اے جرأت
فکر میں تجھ کو بیشتر دیکھا

میں وہ طوفان چشم تر دیکھا
ابر تر کو بھی جس سے تر دیکھا

موت بھی اب تو زیست ہے کہ بہت
درد دل کا علاج کر دیکھا

منزل بیخودی میں آپ کو بھی
ہم نے اپنا نہ ہم سفر دیکھا

ہم نے ملک عدم سے ہستی میں
کیا تماشا نہ آن کر دیکھا

جیتے جی مرگ کی بھی لذت کو
خوب دیکھا کہ تجھ پہ مر دیکھا

درد کی طرح جان جرأت کو
تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

آرام نہ ہو دل کو تو اے یار کریں کیا
پھر پھر کے یہیں آتے ہیں ناچار کریں کیا

صیاد نہ کر منع کہ گلشن کی ہوس میں
تڑپیں نہ یہ تو مرغ گرفتار کریں کیا

احوال کہے بن نہیں بنتی ہے کسی طرح
اور کہیے تو ہوتا ہے وہ بیزار کریں کیا

مثل آئینہ با صفا ہیں ہم
دیکھنے ہی کے آشنا ہیں ہم

دیکھ سایہ کی طرح اے پیارے
ساتھ تیرے ہیں اور جدا ہیں ہم

ٹک تو کر رحم اے بت بے رحم
آخرش بندہ خدا ہیں ہم

ظلم پر اور ظلم کرتے ہو
اس قدر قابل جفا ہیں ہم

ہم بھی کچھ چیز ہیں میاں لیکن
یہ نہیں جانتے کہ کیا ہیں ہم

جرأت

یہ ہے اسکی نقاب کا عالم
ماہ پر جوں سحاب کا عالم

کچھ بھروسا نہیں ہے جینے کا
زندگی ہے حباب کا عالم

سارے عالم سے کچھ جدا ہے آہ
دل خانہ خراب کا عالم

صحبتیں وصل کی کہوں کیا میں
تھا وہ گویا کہ خواب کا عالم

دے ہے گالی سوال بوسہ پر
دیکھتے ہو جواب کا عالم

سوز ھجراں سے دلکا حال ہے یہ
آگ پر جوں کباب کا عالم

کیا چمک پر ہے دیکھیو **جرأت**
اس رخ پر عتاب کا عالم

ذوق

پانی طبیب دے ہے ھمیں کیا بجھا ھوا
ہے دل ھی زندگی سے ھمارا بجھا ھوا

کہتے ھیں آفتاب قیامت جسے سو وہ
نکلا چراغ داغ دل اپنا بجھا ھوا

چشم غضب سے نیم نگہ میرے واسطے
اک نیمچہ ہے زہر میں گویا بجھا ہوا

پھر دلمیں آہ سرد ہوئی میرے شعلہ زن
لو پھر بھڑک اٹھا یہ فتیلہ بجھا ہوا

جل کر اگر بجھا بھی دل سوختہ میرا
یوں جل اٹھے گا جیسے کہ کولا بجھا ہوا

ہم آپ جل بجھے مگر اس دل کی آگ کو
سینے میں ہم نے **ذوق** نہ پایا بجھا ہوا

گذرتی عمر ہے یوں دور آسانی میں
کہ جیسے جائے کوئی کشتی دخانی میں

رکاؤ خوب نہیں طبع کی روانی میں
کہ بو فساد کی آتی ہے بند پانی میں

کہانیاں ہیں حکایات خضر و آب بقا
بقا کا ذکر ہے کیا اس جہان فانی میں

نہیں خضاب سے مطلب مگر یہ موے سفید
سیاہ پوش ہوئے ماتم جوانی میں

مبصروں سے کہو دیکھیں چین ابروے یار
کہ جوہر ایسے کہاں تیغ اصفہانی میں

وہ سید ہے گھر کو سدھارے اور انکے کھوج میں ہم
پھرے بھٹکتے ہوئے کوے بدگمانی میں

ہمیشہ ہے مجھے سرمایہ فنا میں بقا
حباب وار ہوں میں آب زندگانی میں

رند خراب حال کو زاھد نہ چھیڑ تو
تجھکو پرائی کیا بنی اپنی نبیڑ تو

ناخن نہ دے خدا تجھے اے پنجۂ جنوں
دیگا تمام عقل کے بخیے اودھیڑ تو

عمر رواں کا توسن چالاک اس لئے
تجھ کو دیا کہ جلدی کرے یاں سے ایڑ تو

یہ تنگ نائے دھر نہیں منزل فراغ
غافل نہ پاؤں حرص کے پھیلا سکیڑ تو

ہنگامہ گرم ہستی ناپائیدار کا
چشمک ہے برق کی کہ تبسم شرار کا

ہو راز دل نہ یار سے پوشیدہ یار کا
پردہ جو درمیاں نہ ہو دل کے غبار کا

بجھنے کی دلکی آگ نہیں زیر خاک بھی
ہوگا درخت گور پہ میرے چنار کا

اس روے تابناک پہ ہر قطرہ عرق
گویا کہ اک ستارہ ہے صبح بہار کا

ہو پاکدامنوں کو خلش گر سے کیا خطر
کھٹکا نہیں نگاہ کو مژگاں کے خار کا

اے **ذوق** گر ہے ہوش تو دنیا سے دور بھاگ
اس میکدے میں کام نہیں ہوشیار کا

لائی حیات آئی قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

کم ہونگے اس بساط پر ہم جیسے بدقمار
جو چال ہم چلے وہ نہایت بری چلے

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی چلے

ہو عمر خضر بھی تو کہینگے بوقت مرگ
ہم کیا رہے یہاں ابھی آئے ابھی چلے

دنیا نے کس کا راہ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہیں جب تک چلی چلے

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے **ذوق**
اپنی بلا سے باد صبا اب چلی چلے

سبکو دنیا کی ہوس خوار لئے پھرتی ہے
کون پھرتا ہے یہ مردار لئے پھرتی ہے

گھر سے باہر نہ نکلتا کبھی اپنے خورشید
ہوس گرمی بازار لئے پھرتی ہے

کر دیا کیا تیرے ابرو نے اشارہ ظالم
کہ قضا ہاتھ میں تلوار لئے پھرتی ہے

جا کے پھرتا نہ تھا اکبار جہاں، وان مجھکو
بے قراری ہے کہ سو بار لئے پھرتی ہے

مومن

غیروں پہ کھل نہ جائے کہیں راز دیکھنا
میری طرف بھی غمزہ غماز دیکھنا

اڑتے ہی رنگ رخ میرا نظروں سے تھا نہاں
اس مرغ پر شکستہ کی پرواز دیکھنا

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا

دیکھ اپنا حال زار منجم ہوا رقیب
تھا سازگار طالع ناساز دیکھنا
بدکام کا مآل برا ہے جزا کے دن
حال سپہر تفرقہ انداز دیکھنا
مت رکھیو گرد تارک عشاق پر قدم
پا مال ہو نہ جائے سرافراز دیکھنا
کشتہ ہوں اسکے چشم فسوں گر کا اے مسیح
کرنا سمجھ کے دعوئے اعجاز دیکھنا
میری نگاہ خیرہ دکھاتے ہیں غیر کو
بے طاقتی پہ سرزنش ناز دیکھنا
ترک صنم بھی کم نہیں سوز جحیم سے
مومن غم مآل کا آغاز دیکھنا

آنکھوں سے حیا ٹپکے ہے انداز تو دیکھو
ہے بوالہوسوں پر بھی ستم ناز تو دیکھو
اس بت کے لئے میں ہوس حور سے گذرا
اس عشق خوش انجام کا آغاز تو دیکھو
چشمک میری وحشت پہ ہے کیا حضرت ناصح
طرز نگہ چشم فسوں ساز تو دیکھو
ارباب ہوس ہار کے بھی جان پہ کھیلے
کم طالعئے عاشق جاں باز تو دیکھو

مجلس میں میرے ذکر کے آتے ھی اٹھے وہ
بدنامی عشاق کا اعزاز تو دیکھو

محفل میں تم اغیار کو دزدیدہ نظر سے
منظور ھے پنہاں نہ رھے راز تو دیکھو

اس غیرت ناھید کی ھر تان ھے دیپک
شعلہ سا چمک جائے ھے آواز تو دیکھو

دیں پاکی دامن کی گواھی میرے آنسو
اس یوسف بے درد کا اعجاز تو دیکھو

جنت میں بھی مومن نہ ملا ھائے بتوں سے
جور اجل تفرقہ پرداز تو دیکھو

غالب

آہ کو چاھیے اک عمر اثر ھونے تک
کون جیتا ھے تری زلف کے سر ھونے تک

دام ھر موج میں ھے حلقہ صد کام نہنگ
دیکھیں کیا گذرے ھے قطرہ پہ گہر ھونے تک

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا رنگ کروں خون جگر ھونے تک

ھم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ھو جائیں گے ھم تم کو خبر ھونے تک

پرتو خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم

میں بھی ہوں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

یک نظر بیش نہیں فرصت ہستی غافل

گرمئی بزم ہے اک رقص شرر ہونے تک

غم ہستی کا **اسد** کس سے ہو جز مرگ علاج

شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

وہ فراق اور وہ وصال کہاں

وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

فرصت کاروبار شوق کسے

ذوق نظارۂ جمال کہاں

دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا

شور سودائے خط و خال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے

اب وہ رعنائی خیال کہاں

ایسا آسان نہیں لہو رونا

دلمیں طاقت جگر میں حال کہاں

ہمسے چھوٹا قمار خانہ عشق

واں جو جائیں گرہ میں مال کہاں

فکر دنیا میں سر کھپاتا ہوں
میں کہاں اور یہ وبال کہاں

مضمحل ہوگئے قوای **غالب**
وہ عناصر میں اعتدال کہاں

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

یاد تھیں ہمکو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش و نگارِ طاق نسیاں ہو گئیں

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شبکو انکے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے گو لی نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے
ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

جوے خوں آنکھوں سے بہنے دو کہ ہے شامِ فراق
میں یہ سمجھوں گا کہ شمعیں دو فروزاں ہو گئیں

ان پری زادوں سے لیں گے خلد میں ہم انتقام
قدرتِ حق سے یہی حوریں اگر واں ہو گئیں

نیند اسکی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اسکی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سن کر میرے نالے غزل خواں ہوگئیں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یا رب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہوگئیں

بسکہ روکا میں نے اور سینہ میں ابھریں پے بہ پے
میری آہیں بخیہ چاک گریباں ہو گئیں

واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرف درباں ہو گئیں

جاں فزا ہے بادہ جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی گویا رگ جاں ہو گئیں

ہم موحّد ہیں ہمارا کیش ہے ترک رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں اجزائے ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھ پر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

یوں ہی گر روتا رہا غالب تو اے اہل جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے
آخر اس درد کی دوا کیا ہے

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار
یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

میں بھی منھ میں زباں رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے

شکن زلف عنبریں کیوں ہے
نگہ چشم سرمہ سا کیا ہے

سبزہ و گل کہاں سے آتے ہیں
ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے

ہم کو ان سے وفا کی ہے امید
جو نہیں جانتے وفا کیا ہے

جان تم پر نثار کرتا ہوں
میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا
اور درویش کی صدا کیا ہے

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

ستائش گر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضواں کا
وہ اک گلدستہ ہے ہم بے خودوں کے طاق نسیاں کا

بیاں کیا کیجیے بے داد کاوشہاے مژگاں کا
کہ ہر اک قطرہ خوں دانہ ہے تسبیح مرجاں کا

نہ آئی سطوت قاتل بھی مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ہوا ریشہ نیستاں کا

دکھاوں گا تماشا دی اگر فرصت زمانے نے
میرا ہر داغ دل اک تخم ہے سرو چراغاں کا

کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے
کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولے برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

اگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ویرانی تماشا کر
مدار اب کھودنے پر گھاس کے ہے میرے درباں کا

خموشی میں نہاں خوں گشتہ لاکھوں آرزوئیں ہیں
چراغ مردہ ہوں میں بے زباں گور غریباں کا

ہنوز اک پرتو نقش خیال یار باقی ہے
دل افسردہ گویا حجرہ ہے یوسف کے زنداں کا

نہیں معلوم کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا
قیامت ہے سرشک آلودہ ہونا تیری مژگاں کا

نظر میں ہے ہماری جادہ راہ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزاے پریشاں کا

ظلمت کدے میں میرے شب غم کا جوش ہے
اک شمع ہے دلیل سحر سو خموش ہے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال
مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

مئے نے کیا ہے حسن خود آرا کو بے حجاب
اے شوق یاں اجازت تسلیم ہوش ہے

گوہر کو عقد گردن خوباں میں دیکھنا
کیا اوج پر ستارہ گوہرفروش ہے

دیدار بادہ ، حوصلہ‌ساقی ، نگاہ مست
بزم خیال ، میکدۂ بے خروش ہے

اے تازہ واردان بساط ہوائے دل
زنہار گر تمہیں ہوس ناو نوش ہے

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوش نصیحت نیوش ہے

ساقی بجلوہ ، دشمن ایماں و آگہی
مطرب بہ نغمہ ، رہزن تمکین و ہوش ہے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشہ بساط
دامان باغبان و کف گل فروش ہے

لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آکر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش خروش ہے

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب سریر خامہ نوائے سروش ہے

———

میری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے
جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے

خزاں کیا ، فصل گل کہتے ہیں کسکو، کوئی موسم ہو
وہی ہم ہیں، قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

وفائے دلبراں ہے اتفاقی ، ورنہ اے ہمدم
اثر فریاد دلہائے حزیں کا کس نے دیکھا ہے

نہ لائے شوخی اندیشہ، تاب رنج نومیدی
کف افسوس ملنا عہد تجدید تمنا ہے

———

کل کے لئے کر آج نہ خست شراب میں
یہ سوئے ظن ہے ساقی کوثر کے باب میں

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخی فرشتہ ہماری جناب میں

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے سماع میں
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیئے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

اتنا ہی مجھکو اپنی حقیقت سے بعد ہے
جتنا کہ وہم غیر سے ہوں پیچ تاب میں

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

شرم اک ادائے ناز ہے اپنے ہی سے سہی
ہیں کتنے بے حجاب کہ ہیں یوں حجاب میں

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

ہے غیب غیب، جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغول حق ہوں بندگی بوتراب میں

امیر مینائی

اسکی حسرت ہے جسے دل سے مٹا بھی نہ سکوں
ڈھونڈنے اسکو چلا ہوں جسے پا بھی نہ سکوں

اسکے غصے کے مٹانے کی ہیں سو تدبیریں
لاگ کی آگ نہیں ہے کہ بجھا بھی نہ سکوں
چٹکیاں لینے سے دلمیں وہ کریں کیا انکار
داغ کچھ درد نہیں ہے کہ دکھا بھی نہ سکوں
میں اگر گھر سے نکلتا ہوں تو گھر کیوں ہے اداس
کیا دم بازپسیں ہے کہ پھر آ بھی نہ سکوں
کوئی پوچھے تو محبت سے یہ کیا ہے انصاف
وہ مجھے دلسے بھلا دے، میں بھلا بھی نہ سکوں
نقش ہستی میں ابھی محو کئے دیتا ہوں
خط تقدیر نہیں ہے کہ مٹا بھی نہ سکوں

جب سے بلبل تو نے دو تنکے لئے
ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لئے
ہے جوانی خود جوانی کا سنگھار
سادگی گہنا ہے اس سن کے لئے
کون ویرانے میں دیکھے گا بہار
پھول جنگل میں کھلے کن کے لئے
ساری دنیا کے ہیں وہ میرے سوا
مینے دنیا چھوڑ دی جن کے لئے
سب حسیں ہیں زاہدوں کو ناپسند
اب کوئی حور آئے گی ان کے لئے

وصل کا دن اور اتنا مختصر
دن گنے جاتے تھے اس دن کیلئے

صبح کا سونا جو ہاتھ آتا امیر
بھیجتے تحفہ موذن کے لئے

صورت غنچہ کہاں تاب تکلم مجھ کو
مونھ کے سو ٹکڑے ہوں آئے جو تبسم مجھ کو

وقت فرصت تھا میں عبرت کدہ ہستی میں
کف افسوس ملے جس نے کیا گم مجھ کو

ایک کو ایک سے بڑھکر تیرے جلوے کا ھے شوق
آنکھ کہتی ھے نگہ پر ہو تقدم مجھ کو

وائے اے بےخودی شوق کیا خوب سلوک
اسکو جب ڈھونڈ نکالا تو کیا گم مجھ کو

خلوت وصل میں کچھ کام نہیں ساقی کے
جام مے بھر کے پلاؤں میں تمہیں تم مجھ کو

میں تو کیا، عکس سے وہ آئینہ‌رو کہتا ھے
پیار کی آنکھ سے دیکھا نہ کرو تم مجھ کو

میں تیرا عکس تھا اس آئینہ ہستی میں
تو نے کیا پھیر لیا مونھ کہ کیا گم مجھ کو

دیکھتا ہوں کبھی آئینہ تو رو دیتا ہوں
اپنی صورت پہ خود آتا ھے ترحم مجھ کو

داغ

بتاں ماہ وش اجڑی ہوئی منزل میں رہتے ہیں
که جسکی جان جاتی ہے اسی کے دلمیں رہتے ہیں

سراغ مہر و الفت غیر کے دلمیں نه پائیں گے
عبث وہ رات دن اس سعی لاحاصل میں رہتے ہیں

زمیں پر پاؤں نخوت سے نہیں رکھتے پری پیکر
وہ گویا اس مکاں کی دوسری منزل میں رہتے ہیں

محبت میں مزا ہے چھیڑ کا لیکن مزے کی ہو
ہزاروں لطف ہر اک شکوہ باطل میں رہتے ہیں

خدا رکھے سلامت جن کو ان کو موت کب آئے
تڑپتے لوٹتے ہم کوچہ قاتل میں رہتے ہیں

ہزاروں حسرتیں وہ ہیں کہ روکے سے نہیں رکتیں
بہت ارمان ایسے ہیں کہ دلکے دلمیں رہتے ہیں

خدا رکھے محبت نے کیے آباد دونوں گھر
میں انکے دلمیں رہتا ہوں وہ میرے دلمیں رہتے ہیں

کوئی نام و نشاں پوچھے تو اے قاصد بتا دینا
تخلص داغ ہے ہم عاشقوں کے دلمیں رہتے ہیں

غم اس پہ آشکار کیا ہم نے کیا کیا
غافل کو ہوشیار کیا ہم نے کیا کیا

وعدے پہ انتظار کیا ہم نے کیا کیا
جھوٹے کا اعتبار کیا ہم نے کیا کیا

ہاں ہاں تڑپ تڑپ کے گذاری تمہیں نے رات
تم ہی نے انتظار کیا ہم نے کیا کیا

کہتے ہیں وہ شکایت بےداد و جور پر
تمکو خدا نے خوار کیا ہم نے کیا کیا

ناصح بھی ہے رقیب یہ معلوم ہی نہ تھا
کسکو صلاح کار کیا ہم نے کیا کیا

پہلے تو منفعل ہوئے پھر وہ بگڑ گئے
کیوں شکوہ بار بار کیا ہم نے کیا کیا

آہستہ کر کے صاف دل اپنا دکھا دیا
کیوں ان کو شرمسار کیا ہم نے کیا کیا

رسوا کیا جو دلنے تو اب کہ رہے ہیں داغ
دشمن کو رازدار کیا ہم نے کیا کیا

ساز یہ کینہ‌ساز کیا جانیں
ناز والے نیاز کیا جانیں

شمع رو آپ گو ہوئے لیکن
لطف سوز و گداز کیا جانیں

کب کسی در پہ جبہ سائی کی
شیخ صاحب نماز کیا جانیں

جو رہ عشق میں قدم رکھیے
وہ نشیب و فراز کیا جانیں

پوچھیے مے کشوں سے لطف شراب
یہ مزا پاکباز کیا جانیں

جن کو اپنی خبر نہیں اب تک
وہ مرے دلکا راز کیا جانیں

جو گذرتے ہیں داغ پر صدمے
آپ بندہ نواز کیا جانیں

حالی

پیش از ظہور عشق کسی کا نشان نہ تھا
تھا حسن میزباں کوئی مہماں نہ تھا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

کیا جانتے تھے جائے گا جی اک نگاہ میں
تھی دل کی احتیاط مگر بیم جاں نہ تھا

سچ ہے کہ پاس خاطر نازک عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا

رات ان کو بات بات پہ سو سو دئے جواب
مجھ کو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا

رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے ہیں ورنہ یاں
طعن رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا

بزم سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں حالی جادو بیاں نہ تھا

پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا
چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا

مضمون ہے نقش دل میں لدینا مزید کا
کونین سے بھرے گا نہ دامن امید کا

قفل در مراد سب اکبار کھل گئے
چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا

دیکھا ہے ہم نے عالم رحمت کو غور سے
ہے شش جہت میں قحط دل ناامید کا

شرم کرم کی ہیں یہی گر پردہ داریاں
انجام ایک ہوگا شقی و سعید کا

ہے نردبان جذبۂ توفیق درمیان
یاں امتیاز کیا ہے قریب و بعید کا

ہے آسماں پہ تیرے جگر خوار کا دماغ
خون جگر میں نشہ ہے جام نبیذ کا

تسکین نہیں مشاہدہ گاہ گاہ سے
یا رب یہ روزہ دار ہے مشتاق عید کا

دوزخ ہے گر وسیع تو رحمت وسیع تر
لا تقنطو جواب ہے ھل من مزید کا

حالی کی ہیں اگر یہی شیوا بیانیاں
لے گا نہ کوئی نام ظہیر و رشید کا

کل مدعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے
بات اسکی کاٹتے رہے اور ہمزباں رہے

یاران تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محو نالۂ جرس کارواں رہے

یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہل وعظ
یا آپ بھی ملازم پیر مغاں رہے

وصل مدام سے بھی ہماری بجھی نہ پیاس
ڈوبے ہم آب خضر میں اور نیم جاں رہے

کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا رو سیاہ
تم مدعی کے گھر گئے اور میہماں رہے

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

حالی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

اکبر

غنچہ دل کو نسیم عشق نے وا کر دیا
میں مریض ہوش تھا مستی نے اچھا کر دیا

دین سے اتنی الگ حد فنا سے یوں قریب
اسقدر دلچسپ پھر کیوں رنگ دنیا کر دیا

موت سے غفلت جوانی میں تو لذت دے گئی
ہاں مگر پیری میں اس نے مجھ کو رسوا کر دیا

بے تمہارے دیکھے اب دم بھر بھی چین آتا نہیں
سچ بتاؤ جان جاں تم نے مجھے کیا کر دیا

سب کے سب باہر ہوئے وہم و خرد ہوش و تمیز
خانۂ دل میں تم آؤ ہم نے پردا کر دیا

ہو طلب کامل تو بس نعمت اسی کا نام ہے
بھوک نے نان جویں کو من و سلویٰ کر دیا

یوسف معنی کے جلوؤں کو دکھا کر عشق نے
میری بیداری کو بھی خواب زلیخا کر دیا

شاہد بزم ازل نے اک نگاہ ناز سے
عشق کو اس انجمن میں مسند آرا کر دیا

شور شیریں کا مزا رکھا سر فرہاد میں
قیس کو دیوانہ انداز لیلیٰ کر دیا

گردن پروانہ میں ڈالی کمند شوق شمع
رنگ گل کو دیدۂ بلبل کا پھندا کر دیا

ذوق نظارہ سے جانوں کو ملایا خاک میں
گردش چشم بتاں سے حشر برپا کر دیا

بے غرض ہو کر مزے سے زندگی کٹنے لگی
ترک خواہش نے ہمارا بوجھ ہلکا کر دیا

رنگ اڑانا اہل یورپ کا تو ہے اکبر محال
مفت اپنے آپ کو تم نے تماشا کر دیا

یہ بت پنہاں نہیں ہوتے خدا ظاہر نہیں ہوتا
غنیمت وہ زمانہ ہے کہ میں کافر نہیں ہوتا

علوم دنیوی کے بحر میں غوطے لگانے سے
زباں گو صاف ہو جاتی ہے دل طاہر نہیں ہوتا

حضور قلب اگر حاصل نہیں تجھ کو تعجب کیا
خدا جب دل سے غائب ہو تو دل حاضر نہیں ہوتا

نور عرفاں عقل کے پردے میں پنہاں ہو گیا
ہوش میں آنا حجاب روے جاناں ہو گیا

انتشار اہل معنی فیض سے خالی نہیں
بوے خوش پھیلی اگر غنچہ پریشاں ہو گیا

باعث تسکیں نہ تھا باغ جہاں کا کوئی رنگ
جس روش پہ میں چلا آخر پریشاں ہو گیا

ان کی صورت دیکھکر آنے لگی یاد خدا
نور رخ انکا چراغ راہ عرفاں ہو گیا

تیغ کھینچی اس نے ممنون توجہ ہم ہوئے
حسن وہ افسوں ہے جس سے ظلم احساں ہو گیا

خوان الوان فلک پر کیا مسرت ہو مجھے
گور کا لقمہ ہوا جو اس کا مہماں ہو گیا

صورت ظاہر میں دل اک قطرہ خوں تھا فقط
آ گیا جب ہوش میں معنی کا طوفاں ہو گیا

بس یہی دولت مجھے دی تو نے اے عمر دراز
سینہ اک گنجینۂ داغ عزیزاں ہو گیا

بڑھ گئی سوزش جو تجھ بن گل کھلے گلزار میں
زخم دل کے حق میں ہر غنچہ نمک دان ہو گیا

دیکھنے سے شوق پیدا شوق سے پیدا طلب
آفت دل آنکھ تھی دل آفت جاں ہو گیا

شاد عظیم آبادی

اسیر جسم ہوں میعاد قید لا معلوم
یہ کس گناہ کی پاداش ہے خدا معلوم

تری گلی بھی مجھے یوں تو کھینچتی ہے بہت
در اصل ہے مری مٹی کہاں کی کیا معلوم

تعلّقات کا الجھاؤ ہر طرح ظاہر
گرہ کشائی تقدیر نارسا معلوم

سفر ضرور ہے اور عذر کی مجال نہیں
مزہ تو یہ ہے نہ منزل نہ راستا معلوم

دعا کروں نہ کروں سوچ ہے یہی کہ تجھے
دعا کے قبل مرے دل کا مدّعا معلوم

سنی حکایت ہستی تو درمیاں سے سنی
نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم

طلب کریں بھی تو کیا شے طلب کریں اے **شاد**
ہمیں کو آپ نہیں اپنا مدّعا معلوم

نگہ کی برچھیاں جو سہ سکے سینا اسی کا ہے
ہمارا آپ کا جینا نہیں جینا اسی کا ہے

یہ بزم مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی
جو بڑھ کر خود اٹھالے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

مکدر یا مصفا جس کو یہ دونوں ہی یکساں ہوں
حقیقت میں وہی مےخوار ہے پینا اسی کا ہے

امیدیں جب بڑھیں حد سے طلسمی سانپ ہیں زاہد
جو توڑے یہ طلسم اے دوست گنجینا اسی کا ہے

کدورت سے دل اپنا پاک رکھ اے **شاد** پیری میں
کہ جس کو منہ دکھانا ہے یہ آئینا اسی کا ہے

تمناؤں میں الجھایا گیا ہوں
کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں

سویرا ہے بہت اے روز محشر
ابھی بیکار اٹھوایا گیا ہوں

قدم اٹھتے نہیں کیوں جانب دیر
کسی مسجد میں بہکایا گیا ہوں

لحد میں کیوں نہ جاؤں منہ چھپائے
بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

ہوں اس کوچے کے ہر ذرے سے واقف
ادھر سے عمر بھر آیا گیا ہوں

دل مضطر سے پوچھ اے رونق بزم
میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

کجا میں اور کجا اے شاد دنیا
کہاں سے کس جگہ لایا گیا ہوں

جسم کا ساتھ چھٹا آپ سے باہر ہم ہیں
اب تو اپنے لیے اک غیر سے بدتر ہم ہیں

تھک گئے پاؤں گئی در بدری شکر خدا
اب یونہی تا بہ قیامت ترے در پر ہم ہیں

کان مشتاق ہیں آنکھوں کی طرح مدت سے
دیدو آواز کہ اس پردے کے اندر ہم ہیں

تا قیامت رہے آئینہ سلامت یا رب
هر حسین کو ہے یہ دعویٰ کہ سکندر ہم ہیں

عقل سے راہ جو پوچھی تو پکارا یہ جنوں
وہ تو بھٹکی ہوئی خود پھرتی ہے رہبر ہم ہیں

ریاض خیرآبادی

کوئی جانے یہی ہیں ایک جلوہ دیکھنے والے
یہ موسیٰ اچھے آئے جا کے تنہا دیکھنے والے

نئی ناقوس میں پھونکی ہے جس نے روح وہ میں ہوں
ابھی موجود ہیں اہل کلیسا دیکھنے والے

کھلیں گی بے ثباتی دیکھ کر آنکھیں حبابوں کی
یہی ہیں سر اٹھا کر جوش دریا دیکھنے والے

هم اپنی وضع رندانہ کریں کیوں ترک محشر میں
یہی ہونگے وہاں بھی اہل دنیا دیکھنے والے

گرے غش کھا کے موسیٰ تو صدا یہ طور سے آئی
کھلیں آنکھیں تری کچھ تو نے دیکھا دیکھنے والے

سنو افسانۂ جم ! جام رکھ کر سامنے ان کے
ابھی دو چار ہیں جم کا زمانا دیکھنے والے

نشیمن میں نہیں میں تو شرار برق کیوں جائیں
یہ جا کر کون میرا آشیانا دیکھنے والے

یہ جتنے پینے والے ہیں ریاض ان سب کے مرشد ہیں
ہمیشہ جام مے میں نور حق کا دیکھنے والے

آزاد شاہجہاں پوری

سخت مشکل ہے کہ اس کا جاننا ممکن نہیں
اور بے جانے ہمارا ماننا ممکن نہیں

زندگی بھر جاننے کی کوششیں کرنے کے بعد
صرف یہ جانا یہاں کچھ جاننا ممکن نہیں

وہ یہ کہتے ہیں ہمیں پہچاننے کی سعی کر
اور یہاں اپنے کو بھی پہچاننا ممکن نہیں

وحدت بے لوث ہاتھ آئے تو کیوں کر ہاتھ آئے
کثرتیں اتنی ہیں جن کا چھاننا ممکن نہیں

مادے کی ساری تعریفات برحق لیک رب
روح کو آلودگی میں ساننا ممکن نہیں

راز عالم تا زباں لانا تو ممکن ہے مگر
سارے عالم سے لڑائی ٹھاننا ممکن نہیں

کچھ ہو اب ناقص کو کامل جاننا امر محال
کچھ ہو اب ممکن کو واجب ماننا ممکن نہیں

منکر عرفان حق جا شبہ و شک بالکل فضول
ظرف قابل ہے کے آ عرفان نا ممکن نہیں

عقل والو عقل پر غرہ تو اک حد تک درست
لیکن اس کو عقل سے پہچاننا ممکن نہیں

حضرت **آزاد** اب ہم ہیں اور اک ایسا جہاں
جس جہاں کو منقلب گرداننا ممکن نہیں

اقبال

اپنی جولاں‌گاہ زیر آسمان سمجھا تھا میں
آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم!
اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا!
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں!

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصّہ تمام
اس زمین و آسماں کو بیکراں سمجھا تھا میں

کہہ گئیں رازِ محبت پردہ داریہائے شوق!
تھی فغاں وہ بھی جسے ضبط فغاں سمجھا تھا میں

تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے درد ناک
جس کو آواز رحیل کارواں سمجھا تھا میں

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالم رنگ و بو پر
چمن اور بھی آشیاں اور بھی ہیں

اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم
مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں
تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

خرد کے پاس خبر کے سوا کچھ اور نہیں !
ترا علاج نظر کے سوا کچھ اور نہیں
ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا
حیات ، ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں
گراں بہا ہے تو حفظ خودی سے ہے ورنہ
گہر میں آب گہر کے سوا کچھ اور نہیں !
رگوں میں گردش خوں ہے اگر تو کیا حاصل !
حیات ، سوز جگر کے سوا کچھ اور نہیں !
عروس لالہ ! مناسب نہیں ہے مجھ سے حجاب
کہ میں نسیم سحر کے سوا کچھ اور نہیں !

جسے کساد سمجھتے ھیں تاجران فرنگ!
وہ شے متاع ھنر کے سوا کچھ اور نہیں

بڑا کریم ؑ ھے اقبال بے نوا لیکن
عطاے شعلہ ، شرر کے سوا کچھ اور نہیں

دل سوز سے خالی ھے نگہ پاک نہیں ھے
پھر اس میں عجب کیا کہ تو بیباک نہیں ھے

ھے ذوق تجلّی بھی اسی خاک میں پنہاں!!
غافل! تو نرا صاحب ادراک نہیں ھے

وہ آنکھ کہ ھے سرمۂ افرنگ سے روشن
پر کار و سخن ساز ھے! نمناک نہیں ھے

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سر دامن بھی ابھی چاک نہیں ھے

کب تک رھے محکومیٔ انجم میں مری خاک
یا میں نہیں یا گردش افلاک نہیں ھے!!

بجلی ھوں نظر کوہ و بیاباں پہ ھے میری
میرے لیے شایاں خس و خاشاک نہیں ھے!

عالم ھے فقط مومن جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ھے!

حسرت

وصل کی بنتی ھیں ان باتوں سے تدبیریں کہیں
آرزوؤں سے پھرا کرتی ھیں تقدیریں کہیں

بے زبانی ترجمان شوق بیحد ھو تو ھو
ورنہ پیش یار کام آتیں ھیں تقریریں کہیں

مٹ رھی ھیں دل سے یادیں روزگار عیش کی
اب نظر کاھے کو آئیں گی یہ تصویریں کہیں

التفات یار تھا اک خواب آغاز وفا
سچ ھوا کرتی ھیں ان خوابوں کی تعبیریں کہیں

تیری بے صبری ھے **حسرت** خامکاری کی دلیل
گریۂ عشاق میں ھوتی ھیں تاثیریں کہیں

عشق میں جان سے گذر جائیں
اب یہ ھی جی میں ھے کہ مر جائیں

جامہ زیبی نہ پوچھیے ان کی
جو بگڑنے میں بھی سنور جائیں

شب وھی شب ھے، دن وھی دن ھیں
جو تیری یاد میں گذر جائیں

دوش تک بھی بلائے جاں ھیں وہ بال
جانے کیا ھوں جو تا کمر جائیں

شعر در اصل ھیں وھی **حسرت**
سنتے ھی دل میں جو اتر جائیں

نگاہ یار جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

دلوں کو فکر دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

غم جہاں سے جسے ہو فراغ کی خواہش
وہ ان کے درد محبت سے ساز باز کرے

امیدوار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دلنواز کرے

تیرے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

آنکھوں کو انتظار سے گرویدہ کر چلے
تم یہ تو خوب کار پسندیدہ کر چلے

مایوس دل کو پھر سے وہ شوریدہ کر چلے
بیدار سارے فتنۂ خوابیدہ کر چلے

اظہار التفات کے پردے میں اور بھی
وہ عقدہائے شوق کو پیچیدہ کر چلے

تسکین اضطراب کو آئے تھے وہ مگر
بیتابیوں کی روح کو بالیدہ کر چلے

اہلِ نظر کو بے خبرِ دو جہاں کیا
ایسی کچھ اک نگاہ وہ دزدیدہ کر چلے

تھا عشقِ یار بھی کوئی گنجینۂ مراد
ویران دل میں ہم جسے پوشیدہ کر چلے

یہ طرفہ ماجرا ہے کہ حسرت سے مل کے وہ
کچھ جان و دل کو اور بھی شوریدہ کر چلے

ارباب اشتیاق سے پردا نہ چاہیے
اے حسن خودنما تجھے ایسا نہ چاہیے

ان کا ستم بھی عین کرم ہے خواص کو
اسکا مگر عوام میں چرچا نہ چاہیے

کچھ حد سے بڑھ چلی ہیں تیری کج ادائیاں
اس درجہ اعتبار تمنا نہ چاہیے

اتنی سی شے کا تم سے تقاضا کرے گا کون
دل لے کے ہم سے آنکھ چرانا نہ چاہیے

اخفاے عشق مدنظر ہو تو حسن سے
اظہار آرزو میں محابا نہ چاہیے

حسرت کی طرح اور بھی مشتاق ہیں بہت
اس حسن بے مثال کو چھپنا نہ چاہیے

روش حسن مراعات چلی جاتی ہے
ہم سے اور ان سے وہی بات چلی جاتی ہے

اس جفاجو سے بہ ایماے تمنا اب تک
ہوس لطف و عنایات چلی جاتی ہے

مل ہی جاتے ہیں پشیمانی غم کے اسباب
شوق حرماں کی مدارات چلی جاتی ہے

ہم سے ہر چند وہ ظاہر میں خفا ہیں لیکن
کوشش پرسش حالات چلی جاتی ہے

دن کو ہم ان سے بگڑتے ہیں وہ شب کو ہم سے
رسم پابندی اوقات چلی جاتی ہے

تقاضا کر رہا ہے اب یہ حسن تازہ‌کار ان کا
کہ جس نے دل دیا تھا جان بھی ہم پر فدا کر دے

اثر ایسا کہاں سے لاؤں یارب نالۂ دل سے
جو اس بے مہر کو بھی راز غم سے آشنا کر دے

گراں گذرے گا حرف آرزو اس طبع نازک پر
نگاہ شوق اس مفہوم رنگیں کو ادا کر دے

ہر حال میں ناشادیٔ دل یاد رہے گی
پابندی حرماں خدا داد رہے گی

بیکار ڈراتے ہیں مجھے قید ستم سے
واں روح وفا اور بھی آزاد رہے گی

معمور غم عشق عجب دل کی ہے بستی
هرچند اجاڑو اسے آباد رہے گی

انکار اور اک جرعۂ صہبا سے بھی انکار
ساقی یہ تیری کم نگہی یاد رہے گی

میں ہوں وہ رضاجو کہ طبیعت میری حسرت
ناکامئی جاوید سے بھی شاد رہے گی

حفیظ جالندھری

کہہ گئے ''الفراق،، یارانے
رہ گئے ناتمام افسانے

دوستی اب گلے کا ہار نہیں
تار ٹوٹا بکھر گئے دانے

صبحدم اپنی اپنی راہ لگے
شمع کے جان نثار پروانے

ساقیا! یہ روا روی کا ہے دور
بھر دے بھر دے کچھ اور پیمانے

ماتم اہلِ ظرف کے دن ہیں
احتراماً ہیں بند میخانے

زندگی سے نپٹ رہا ہوں میں
موت کیا ہے مری بلا جانے

کر رہا ہوں تلاش اپنوں کی
جب سے گم ہو گئے ہیں بیگانے

ہم نے روکا **حفیظ** کو ورنہ
اور بھی کچھ لگے تھے فرمانے

تگ و دو ہے ترے جلو میں **حفیظ**
اور کیا چاہتا ہے دیوانے

ہم ہی میں تھی نہ کوئی بات یاد نہ تم کو آ سکے
تم نے ہمیں بھلا دیا ہم نہ تمہیں بھلا سکے

تم ہی نہ سن سکے اگر قصۂ غم سنے گا کون
کس کی زبان کھلے گی پھر ہم نہ اگر سنا سکے

ہوش میں آ چکے تھے ہم جوش میں آ چکے تھے ہم
بزم کا رنگ دیکھ کر سر نہ مگر اٹھا سکے

رونق بزم بن گئے لب پہ حکایتیں رہیں
دل میں شکائتیں رہیں لب نہ مگر ہلا سکے

عجز سے اور بڑھ گئی برہمئی مزاج دوست
اب وہ کرے علاج دوست جس کی سمجھ میں آ سکے

ایسا ہو کوئی نامہ‌بر بات پہ کان دھر سکے
سن کے یقین کر سکے جا کے انہیں سنا سکے

شوق وصال ہے یہاں لب پہ سوال ہے یہاں
کس کی مجال ہے یہاں ہم سے نظر ملا سکے

اہلِ زباں تو ہیں بہت، کوئی نہیں ہے اہل دل
کون تیری طرح حفیظ درد کے گیت گا سکے

جھگڑا دانے پانی کا ہے دام و قفس کی بات نہیں
اپنے بس کی بات نہیں ، صیاد کے بس کی بات نہیں

جان سے پیارے یار ہمارے، قید وفا سے چھوٹ گئے
سارے رشتے ٹوٹ گئے اک تار نفس کی بات نہیں

تیرا پھولوں کا بستر بھی راہ گذار سیل میں ہے
آقا! اب یہ بندے ہی کے خار و خس کی بات نہیں

دونوں ہجر میں رو دیتے ہیں ،دونوں وصل کے طالب ہیں
حسن بھلا کیسے پہنچانے عشق ہوس کی بات نہیں

نوش ہے عنواں، نیش نتیجہ،ان شیریں افسانوں کا
تذکرہ ہے انسانوں کا یہ مور و مگس کی بات نہیں

کار مغاں یہ قند کا شربت بیچنے والے کیا جانیں!
تلخی و مستی بھی ہے غزل میں خالی رس کی بات نہیں

تشکیل و تکمیل فن میں جو بھی حفیظ کا حصہ ہے
نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

میرے خیال و خواب کی دنیا لیے ہوے
پھر آ گیا کوئی رخ زیبا لیے ہوے

پھر دل میں آ بسی ہے کسی انجمن کی یاد
اجڑے ہوے بہشت کا نقشہ لیے ہوے

یہ کم نگاہیاں ہیں تو پھر کس امید پر
بیٹھا رہوں فریب تمنا لیے ہوے

اس فتنۂ شباب کا عالم نہ پوچھیے
اک حشر اٹھ رہا ہے تماشا لیے ہوے

حسرت برس رہی ہے رخ نامراد پر
یہ کون جا رہا ہے تمنا لیے ہوے

گو آج تک کسی سے توقع نہ تھی **حفیظ**
پھرتا ہوں اک جہان کا شکوا لیے ہوے

نگاہ آرزو آموز کا چرچا نہ ہو جاے
شرارت سادگی ہی میں کہیں رسوا نہ ہو جاے

انہیں احساس تمکیں ہو کہیں ایسا نہ ہو جاے
جو ہونا ہے ابھی اے جرأت رندانہ ہو جاے

بظاہر سادگی سے مسکرا کر دیکھنے والو!
کوئی کم بخت ناواقف اگر دیوانہ ہو جاے

ارادے باندھتا ہوں، سوچتا ہوں، توڑ دیتا ہوں
کہیں ایسا نہ ہو جائے، کہیں ایسا نہ ہو جاے

میری الفت تعجب ہو گئی، توبہ معاذ اللہ
کہ مونھہ سے بھی نہ نکلے بات اور افسانہ ہو جاے

آرزو لکھنؤی

گورے گورے چاند سے منہ پر کالی کالی آنکھیں ہیں
دیکھ کے جن کو نیند اڑ جائے وہ متوالی آنکھیں ہیں

چاہ نے اندھا کر رکھا ہے اور نہیں تو دیکھے جی
آنکھیں آنکھیں سب ہیں برابر، کون نرالی آنکھیں ہیں

بے جس کے اندھیر ہے سب کچھ ایسی بات ہے اس میں کیا
جی کا ہے یہ باؤلاپن یا بھولی بھالی آنکھیں ہیں

آرزو اب بھی کھوٹے کھرے کو کر کے الگ رکھ ہی دینگی
ان کی پرکھ کا کیا کہنا ہے جو ٹکسالی آنکھیں ہیں

اصغر گونڈوی

کوئی محمل‌نشیں کیوں شاد یا ناشاد ہوتا ہے
غبار قیس خود اٹھتا ہے خود برباد ہوتا ہے

قفس کیا؟ حلقہ‌ہاے دام کیا؟ رنج اسیری کیا؟
چمن پر مٹ گیا جو ہر طرح آزاد ہوتا ہے

بنا لیتا ھے موج خون دل سے اک چمن اپنا
وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ھوتا ھے

سمائے جا رھے ھیں اب وہ جلوے دیدہ و دل میں
یہ نظارہ ھے یا ذوق نظر برباد ھوتا ھے

یہاں کوتاھی ذوق عمل ھے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ھیں وھیں صیاد ھوتا ھے

یہاں مستوں کے سر الزام ھستی ھی نہیں **اصغر**
پھر اسکے بعد ھر الزام بے بنیاد ھوتا ھے

وہ نغمہ بلبل رنگیں نوا اک بار ھو جائے
کلی کی آنکھ کھل جائے ، چمن بیدار ھو جائے

نظر وہ ھے جو اس کون و مکاں سے پار ھو جائے
مگر جب روے تاباں پر پڑے بیکار ھو جائے

تم اس کافر کا ذوق بندگی اب پوچھتے کیا ھو
جسے طاق حرم بھی ابروے خمدار ھو جائے

سحر لائے گی کیا پیغام بیداری شبستاں میں
نقاب رخ الٹ دو خود سحر بیدار ھو جائے

یہ اقرار خودی ھے ، دعویٰ ایماں و دیں کیسا؟
تیرا اقرار جب ھے خود سے بھی انکار ھو جائے

نظر اس حسن پر ٹھہرے تو آخر کس طرح ٹھہرے
کبھی خود پھول بن جائے، کبھی رخسار ہو جائے

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موج حوادث سے
اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے

آلام روزگار کو آساں بنا دیا
جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

یوں مسکرائے جان سی کلیوں میں پڑ گئی
یوں لب کشا ہوئے کہ گلستاں بنا دیا

اے شیخ! وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی
کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

کچھ آگ دی ہوس میں تو تعمیر عشق کی
جب خاک کر دیا اسے عرفاں بنا دیا

اک برق تھی ضمیر میں فطرت کے موجزن
آج اسکو حسن و عشق کا ساماں بنا دیا

مجبوری حیات میں راز حیات ہے
زنداں کو ہم نے روزن زنداں بنا دیا

وہ شورشیں نظام جہاں جن کے دم سے ہے
جب مختصر کیا انہیں انساں بنا دیا

ہم اک نگاہ ناز کو سمجھے تھے نیشتر
تم نے تو مسکرا کے رگ جاں بنا دیا

کہتے ہیں اک فریب مسلسل ہے زندگی
اسکو بھی وقف حسرت و حرماں بنا دیا

عالم سے بے خبر بھی ہوں عالم میں بھی ہوں میں
ساقی نے اس مقام کو آساں بنا دیا

اس حسن کاروبار کو مستوں سے پوچھیے
جن کو فریب ہوش نے عصیاں بنا دیا

جلوہ تیرا اب تک ہے نہاں چشم بشر سے
ہر ایک نے دیکھا ہے تجھے اپنی نظر سے

مے دافع آلام ہے، تریاق ہے، لیکن
کچھ اور ہی ہو جاتی ہے ساقی کی نظر سے

وہ شوخ بھی معذور ہے، مجبور ہوں میں بھی
کچھ فتنے اٹھے حسن سے کچھ حسن نظر سے

اس عالم ہستی میں نہ مرنا ہے نہ جینا
تو نے کبھی دیکھا نہیں مستوں کی نظر سے

جگر

کسی صورت نموذ سوز پنہانی نہیں جاتی
بجھا جاتا ہے دل چہرے کی تابانی نہیں جاتی

صداقت ہو تو دل سینوں سے کھنچنے لگتے ہیں واعظ
حقیقت خود کو منوا لیتی ہے مانی نہیں جاتی

محبت میں اک ایسا وقت بھی دل پر گذرتا ہے
کہ آنسو خشک ہو جاتے ہیں طغیانی نہیں جاتی

جگر وہ بھی ز سر تا پا محبت ہی محبت ہیں
مگر ان کی محبت صاف پہچانی نہیں جاتی

محبت صلح بھی پیکار بھی ہے
یہ شاخ گل بھی ہے تلوار بھی ہے

طبیعت عشق کی خود دار بھی ہے
ادھر نازک مزاج یار بھی ہے

یہ فتنے جن سے اک دنیا ہے نالاں
انہیں سے گرمی بازار بھی ہے

غنیمت ہے کہ اس دور ہوس میں
تیرا ملنا بہت دشوار بھی ہے

خبردار اے سبک ساران ساحل
یہ ساحل ہی کبھی منجدھار بھی ہے

جو کوئی سن سکے تو نکہت گل
شکست رنگ کی جھنکار بھی ہے

یہ لالہ و گل یہ صحن و روش ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریب جنوں کے پردے میں تعمیر گلستاں ہوتے ہیں

بیدار عزائم ہوتے ہیں ، اسرار نمایاں ہوتے ہیں
وہ جتنے ستم فرماتے ہیں سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں

یہ خون جو ہے مظلوموں کا ضائع تو نہ جائیگا لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صرف بہاراں ہوتے ہیں

آسودہ ساحل تو ہے مگر شاید یہ تجھے معلوم نہیں
ساحل سے بھی موجیں اٹھتی ہیں خاموش بھی طوفاں ہوتے ہیں

جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں **جگر**
جب وقت شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں

وحشت کلکتوی

درد کا میرے یقیں آپ کریں یا نہ کریں
عرض اتنی ہے کہ اس راز کا چرچا نہ کریں

لاکھ غافل سہی پر ایسے بھی ہم کور نہیں
کہ چمن دیکھ کے ذکر چمن آرا نہ کریں

عقل و دانش سے تو کچھ کام نہ نکلا اپنا
کب تک آخر دل دیوانہ کا کہنا نہ کریں

وہ نگاہیں عجب انداز سے ہیں عشوہ فروش
غم پنہاں کو ہمارے کہیں رسوا نہ کریں

تیرے آشفتہ سر ایسے بھی نہیں سودائی
کہ دل و دیں کے لئے زلف کا سودا نہ کریں

میں نے بیہودہ توقع کی سزا پائی ہے
کچھ خیال آپ مری حسرت دل کا نہ کریں

میرے ارمانوں کو کاش اتنی سمجھ ہو **وحشت**
کہ ان آنکھوں سے مروت کا تقاضا نہ کریں

حریف دیدۂ دیدار جو کیا ہو حجاب اس کا
نگاہ آشنا ہے مجھ کو ہر تار نقاب اس کا

مجسم سہر ہے ہرچند مہر اُس کی بلا نکلی
تری چشم حیا پرور کہ عالم ہے خراب اس کا

ہے ارزاں اس قدر دیدار جاناں ہم نہ مانیں گے
زلیخا کیا سناتی ہے خیال اس کا ہے خواب اس کا

کرم کی ہے نظر افتادگاں خاک پر دائم
محافظ ہے دلوں کا طرۂ عالی جناب اس کا

ستم ہے قطع امید آہ کیسا ہو گیا ٹھنڈا
دل شیدا کہ اک طوفان تھا گویا اضطراب اس کا

وہ زلف خم بخم کب ہاتھ اٹھاتی ہے مرے سر سے
گرہ ہو کر رہا ہے میرے دل میں پیچ و تاب اس کا

فراق گورکھپوری

آج بھی قافلۂ عشق رواں ہے کہ جو تھا
وہی میل اور وہی سنگ نشاں ہے کہ جو تھا

پھر ترا غم وہی رسوائے جہاں ہے کہ جو تھا
پھر فسانہ بحدیث دگراں ہے کہ جو تھا

منزلیں گرد کی مانند اڑی جاتی ہیں
وہی انداز جہان گذراں ہے کہ جو تھا

منزلیں عشق کی تا حد نظر سونی ہیں
کوئی رہرو نہ یہاں ہے، نہ وہاں ہے کہ جو تھا

یوں تو اس دور میں بے کیف سی ہے بزم حیات
ایک ہنگامہ سر رطل گراں ہے کہ جو تھا

جو بھی کر جور و ستم جو بھی کر احسان و کرم
تجھ پر اے دوست وہی وہم و گماں ہے کہ جو تھا

آنکھ جھپکی کہ ادھر ختم ہوا روز وصال
پھر بھی اس دن پہ قیامت کا گماں ہے کہ جو تھا

قرب ہی کم ہے نہ دوری ہی زیادہ لیکن
آج وہ ربط کا احساس کہاں ہے کہ جو تھا

پھر سر میکدۂ عشق ہے اک بارش نور
چھلکے جاموں سے چراغاں کا سماں ہے کہ جو تھا

آج بھی آگ دبی ہے دل انساں میں فراق
آج بھی سینوں سے اٹھتا وہ دھواں ہے کہ جو تھا

شام غم کچھ اس نگاہ ناز کی باتیں کرو
بے خودی بڑھتی چلی ہے راز کی باتیں کرو

یہ سکوت ناز یہ دل کی رگوں کا ٹوٹنا
خامشی میں کچھ شکست ساز کی باتیں کرو

نکہت زلف پریشاں داستان شام غم
صبح ہونے تک اسی انداز کی باتیں کرو

ہر رگ دل وجد میں آتی رہے دکھتی رہے
یوں ہی اس کے جا و بے جا ناز کی باتیں کرو

جو عدم کی جان ہے جو ہے پیام زندگی
اس سکوت راز اس آواز کی باتیں کرو

عشق رسوا ہو چلا بے کیف سا بیزار سا
آج اس کی نرگس غماز کی باتیں کرو

جس کی فرقت نے پلٹ دی عشق کی کایا فراق
آج اس عیسیٰ نفس دمساز کی باتیں کرو

فانی

پھر وہ انداز نظر یاد آیا
چاک دل تا بہ جگر یاد آیا

ذوق ارباب نظر یاد آیا
سجدہ بے منت سر یاد آیا

ہر تبسم پہ یہ کھاتا ہوں فریب
کہ انہیں دیدۂ تر یاد آیا

پھر ترا نقش قدم ہے درکار
سجدۂ راہ گذر یاد آیا

جمع کرتا ہوں غبار رہ دوست
سر شوریدہ مگر یاد آیا

ہائے وہ معرکۂ ناوک ناز
دل بچایا تو جگر یاد آیا

آئینہ اب نہیں دیکھا جاتا
میں بہ عنوان دگر یاد آیا

درد کو پھر ہے مرے دل کی تلاش
خانہ برباد کو گھر یاد آیا

اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانی
کیا کروگے وہ اگر یاد آیا

تاثیر

وہ ملے تو بے تکلف نہ ملے تو بے ارادہ
نہ طریق آشنائی نہ رسوم جام و بادہ

تیری نیم کش نگاہیں ترا زیر لب تبسم
یونہی اک ادائے مستی یونہی اک فریب سادہ

وہ کچھ اسطرح سے آئے مجھے اسطرح سے دیکھا
میری آرزو سے کم تر میری تاب سے زیادہ

یہ دلیل خوش دلی ہے میرے واسطے نہیں ہے
وہ دھن کہ ہے شگفتہ وہ جبیں کہ ہے کشادہ

حضور یار بھی آنسو نکل ہی آتے ہیں
کچھ اختلاف کے پہلو نکل ہی آتے ہیں

مزاج ایک، نظر ایک، دل بھی ایک سہی
معاملات من و تو نکل ہی آتے ہیں

ہزار ہم‌سخنی ہو ہزار ہم‌نظری
مقامِ جنبشِ ابرو نکل ہی آتے ہیں

حنائے ناخنِ پا ہو کہ حلقہ سرِ زلف
چھپاؤ بھی تو یہ جادو نکل ہی آتے ہیں

جنابِ شیخ وضو کے لیے سہی لیکن
کسی بہانے لبِ جو نکل ہی آتے ہیں

متاعِ عشق وہ آنسو جو دل میں ڈوب گئے
زمیں کا رزق جو آنسو نکل ہی آتے ہیں

اختر شیرانی

ان کو بلائیں اور وہ نہ آئیں تو کیا کریں
بیکار جائیں اپنی دعائیں تو کیا کریں

اک زہرہ‌وش ہے آنکھ کے پردوں میں جلوہ گر
نظروں میں آسماں نہ سمائے تو کیا کریں

ناصح ہماری توبہ میں کچھ شک نہیں مگر
شانہ ہلائیں آ کے گھٹائیں تو کیا کریں

عہدِ طرب کی یاد میں رویا کیے بہت
اب مسکرا کے بھول نہ جائیں تو کیا کریں

اک دن کی بات ہو تو اسے بھول جائیں ہم
نازل ہوں دل پہ روز بلائیں تو کیا کریں

عابد

چین پڑتا ہے دل کو آج نہ کل
وہی الجھن گھڑی گھڑی پل پل

میرا جینا ہے سیج کانٹوں کی
ان کے مرنے کا نام تاج محل

یا کبھی عاشقی کا کھیل نہ کھیل
یا اگر مات ہو تو ہاتھ نہ مل

آ رہی ہے صدا پپیے کی
جس نے سر پر اٹھا لیا جنگل

کیا سہانی گھٹا ہے ساون کی
سانوری نار مدھ بھری چنچل

نہ ہوا رفع میرے دل کا غبار
کیسے کیسے برس گئے بادل

پیار کی راگنی انوکھی ہے
اس میں لگتی ہیں سب سریں کومل

بات تیزی سے یوں وہ کرتے ہیں
جیسے لہرائے ریشمی آنچل

بن پیے انکھڑیاں نشیلی ہیں
نین کالے ہیں تیرے بن کاجل

مجھے دھوکا ہوا کہ جادو ہے
پاؤں بجتے ہیں تیرے بن چھاگل

کبھی بدلا نہ کام دیو کا روپ
وہی سج دھج رہی وہی چھل بل

لاکھ آندھی چلے خیاباں میں
مسکراتے ہیں طاقچوں میں کنول

لاکھ بجلی گرے گلستاں پر
لہلہاتی ہے شاخ میں کونپل

کھل رہا ہے گلاب ڈالی پر
جل رہی ہے بہار کی مشعل

کوہکن سے مفر نہیں کوئی
بے ستوں ہو کہیں کہ بندھیاچل

ایک دن پتھروں کے بوجھ تلے
خود بخود گر پڑیں کے راج محل

میں نے ہائے جو کی تو بات ہے اور
تیری چاہت میں جی نہ تھا بیکل

دم رخصت وہ چپ رہے عابد
آنکھ میں پھیلتا گیا کاجل

نشتر کی نوک دل میں اتارے چلے گئے
ہم یوں عروس غم کو سنوارے چلے گئے

آیا نہ ہاتھ گوشۂ دامان التفات
لیکن فقیر ہاتھ پسارے چلے گئے

قائم رہیں بوصف کرم بھی حدود ناز
دریا کے ساتھ ساتھ کنارے چلے گئے

دل کو تمہیں نے ہاتھ میں لیکر مسل دیا
ہم سادہ دل تمہیں کو پکارے چلے گئے

چلنا رہِ حیات پہ دشوار تھا مگر
تیرے متاع غم کے سہارے چلے گئے

آیا تیرا خیال مٹے نقش ماسوا
ابھرا افق سے چاند ستارے چلے گئے

محفل کو ناگوار تھی عرض شکست دل
محفل سے اٹھ کے درد کے مارے چلے گئے

ہاں اے زمین گور غریباں جواب دے
کیوں مجھ سے روٹھ کر میرے پیارے چلے گئے

عابد زمانہ ہم کو مٹاتا چلا گیا
ہم نقش زندگی کو ابھارے چلے گئے

غم دوران غم جاناں کا نشاں ہے کہ جو تھا
وصف خوباں بحدیث دگراں ہے کہ جو تھا

لذت عرض وفا راحت جاں ہے کہ جو تھی
دل تپاں اشک رواں شوق جواں ہے کہ جو تھا

شرح و آئین کی تعزیر کے باوصف نیاز
لب رخسار کی جانب نگراں ہے کہ جو تھا

پردہ شرم کی زنجیر کے ہوتے ہوے ناز
سر بازار وفا جلوہ کناں ہے کہ جو تھا

گرچہ مدت سے نہیں سامنے وہ آئینہ رو
میرے دل پر وہی حیرت کا سماں ہے کہ جو تھا

عشق کی طرز تکلم وہی چپ ہے کہ جو تھی
لب خوش گوے ہوس محو بیاں ہے کہ جو تھا

میرے پاؤں میں ہیں الجھے ہوے ریشم کے سے تار
ہم دمو! یہ تو وہی بند گراں ہے کہ جو تھا

خاک آلودہ ہے گل غرقۂ خوں ہے بلبل
یہ چمن غمکدہ نوحہ گراں ہے کہ جو تھا

شوکت پرویز عیاں ہے کہ جو تھی
نکتہ محنت فرہاد نہاں ہے کہ جو تھا

سنگ طفلاں سے ذرا بچ کے رہے قصر بلند
یہ وہی کارگۂ شیشہ گراں ہے کہ جو تھا

جلوہ یار سے کیا شکوہ بے جا کیجیے
شوق دیدار کا ساماں وہ کہاں ہے کہ جو تھا

میرے ہنسنے پہ خفا تھے میرے رونے پہ ہنسے
وہی رنگ ستم عشوہ گراں ہے کہ جو تھا

حلقۂ وعظ سے اب تک ہے گریزاں دنیا
حلقۂ زلف مدار دو جہاں ہے کہ جو تھا

رهگذاروں کے صنم رهزن دیں هیں اب تک
وهی اسلوب جہاں گذراں ہے کہ جو تھا

دوستو! هم نفسو! سنتے هو عابد کی غزل
یہ وهی شعلہ نوا سوختہ جاں ہے کہ جو تھا

صوفی غلام مصطفے تبسم

هزار گردش شام و سحر سے گزرے هیں
وہ قافلے جو تیری رہ گزر سے گزرے هیں

ابھی هوس کو میسر نہیں دلوں کا گداز
ابھی یہ لوگ مقام نظر سے گزرے هیں

هر ایک نقش پہ تھا تیرے نقش پا کا گماں
قدم قدم پہ تری رہ گزر سے گزرے هیں

نہ جانے کونسی منزل پہ جاکے رک جائیں
نظر کے قافلے دیوار و در سے گزرے هیں

رحیل شوق سے لرزاں تھا زندگی کا شعور
نہ جانے کس لئے هم بے خبر سے گزرے هیں

کچھ اور پھیل گئیں درد کی کٹھن راهیں
غم فراق کے مارے جدھر سے گزرے هیں

جہاں سرور میسر تھا جام و مے کے بغیر
وہ میکدے بھی هماری نظر سے گزرے هیں

نظر میں ڈھل کے ابھرتے ھیں دل کے افسانے
یہ اور بات ھے دنیا نظر نہ پہچانے

وہ بزم دیکھی ھے میری نگاہ نے کہ جہاں
بغیر شمع بھی جلتے رھے ھیں پروانے

یہ کیا بہار کا جوبن یہ کیا نشاط کا رنگ
فسردہ میکدے والے اداس میخانے

میرے ندیم! تیری چشم التفات کی خیر
بگڑ بگڑ کے سنورتے گئے ھیں افسانے

یہ کس کی چشم فسوں‌ساز کا کرشمہ ھے
کہ ٹوٹ کر بھی سلامت ھیں دل کے بتخانے

نگاہ ناز میں دل سوزئی نیاز کہاں
یہ آشنائے نظر ھیں دلوں کے بیگانے

فیض احمد فیض

وا سوخت

سچ ھے ھمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

ھاں، جو جفا بھی آپ نے کی، قاعدے سے کی
ھاں، ھم ھی کاربند اصول وفا نہ تھے

آئے تو یوں کہ جیسے ھمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے

کیوں داد غم، ہمیں نے طلب کی برا کیا
ہم سے جہاں میں کشتہ غم اور کیا نہ تھے

گر فکر زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
کیوں محو مدح خوبی تیغ ادا نہ تھے

ہر چارہ‌گر کو چارہ‌گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دکھ تھے بہت لادوا نہ تھے

لب پر ہے تلخئی مئے ایام ورنہ **فیض**
ہم تلخئی کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

اسرار الحق مجاز

جنون شوق اب بھی کم نہیں ہے
مگر وہ آج بھی برہم نہیں ہے

بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے

بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے

تقاضے کیوں کروں پیہم نہ ساقی
کسے یاں فکر بیش و کم نہیں ہے

مری بربادیوں کا ہم‌نشینو!
تمہیں کیا خود مجھے بھی غم نہیں ہے

ابھی بزم طرب سے کیا اٹھوں میں
ابھی تو آنکھ بھی پر نم نہیں ہے

بایں سیلِ غم و سیلِ حوادث
مرا سر ہے کہ اب بھی خم نہیں ہے

مجاز اک بادہ کش تو ہے یقیناً
جو ہم سنتے تھے وہ عالم نہیں ہے

حامد علی خاں

بیداد تری چرخ جفاجو نہیں جاتی
میں چپ ہوں پرانی یہ میری خو نہیں جاتی

مینا ہے وہی اور وہی بادۂ رنگیں
اس دل سے تیری یاد پری رو نہیں جاتی

گلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے
پھولوں سے ابھی تک تری خوشبو نہیں جاتی

سو جلوے سے محروم ہے میری نگۂ تنگ
تو سامنے ہر سو، یہ بہ ہر سو نہیں جاتی

میں اور جنوں محرم منزل ہیں پر اے عقل!
جاتے ہیں جب اس بزم میں ہم تو نہیں جاتی

احمد ندیم قاسمی

شام کو صبح چمن یاد آئی
کس کی خوشبوے بدن یاد آئی

جب خیالوں میں کوئی موڑ آیا
تیرے گیسو کی شکن یاد آئی

یاد آئے ترے پیکر کے خطوط
اپنی کوتاھی فن یاد آئی

چاند جب دور افق پر ڈوبا
ترے لہجے کی تھکن یاد آئی

دن شعاعوں سے اُلجھتے گزرا
رات آئی تو کرن یاد آئی

حفیظ ھوشیار پوری

راز سربستہ محبت کی زباں تک پہنچے
بات بڑھکر یہ خدا جانے کہاں تک پہنچے

کیا تصرف ھے ترے حسن کا اللہ اللہ
جلوے آنکھوں سے اُتر کر دل و جاں تک پہنچے

تری منزل پہ پہنچنا کوئی آسان نہ تھا
سرحد عقل سے گذرے تو یہاں تک پہنچے

حیرت عشق مری، حسن کا آئینہ ھے
دیکھنے والے کہاں سے ھیں کہاں تک پہنچے

کھل گیا آج نگاہیں ہیں نگاہیں اپنی
جلوے ہی جلوے نظر آئے جہاں تک پہنچے

وہی اس گوشۂ داماں کی حقیقت جانے
جو مرے دیدۂ خونابہ فشاں تک پہنچے

ابتدا میں جنھیں ہم ننگِ وفا سمجھے تھے
ہوتے ہوتے وہ گلے حسن بیاں تک پہنچے

آہ، وہ حرف تمنا کہ نہ لب تک آئے
ہائے وہ بات کہ اک اک کی زباں تک پہنچے

کس کا دل ہے کہ سنے قصۂ فرقت میرا
کون ہے جو مرے اندوہ نہاں تک پہنچے

خلش انگیز تھا کیا کیا تری مژگاں کا خیال
ٹوٹ کر دل میں یہ نشتر رگِ جاں تک پہنچے

نہ پتہ سنگ نشاں کا نہ خبر رہبر کی
جستجو میں ترے دیوانے یہاں تک پہنچے

نہ غبارِ رہِ منزل ہے نہ آواز جرس
کون مجھ رہرو گم کردہ نشاں تک پہنچے

صاف توہین ہے یہ درد محبت کی **حفیظ**
حسن کا راز ہو اور میری زباں تک پہنچے

عبدالحمید عدم

ارمانوں کی جوت جگائے ایک زمانہ بیت گیا
آسوں کو پروان چڑھائے ایک زمانہ بیت گیا

اب کیا ہم کو دور زمانہ ہوش میں لائے گا ساقی
ہم کو شاید ہوش میں آئے ایک زمانہ بیت گیا

عہدِ بہاراں، جوشِ جوانی، کنجِ گلستاں، تنہائی
چاندنی راتیں اور دو سائے ایک زمانہ بیت گیا

دل کو ڈھارس دینے والے اب اتنی تکلیف نہ کر
اس گھر میں قندیل جلائے ایک زمانہ بیت گیا

آؤ عدم پھر سندر سندر مورتیوں سے پیار کریں
اجلے اجلے دھوکے کھائے، ایک زمانہ بیت گیا

ساحر لدھیانوی

طرب زاروں پہ کیا بیتی، صنم خانوں پہ کیا گذری
دل زندہ ! ترے مرحوم ارمانوں پہ کیا گذری

زمیں نے خون اگلا آسماں نے آگ برسائی
جب انسانوں کے دل بدلے تو انسانوں پہ کیا گذری

ہمیں یہ فکر ان کی انجمن کس حال میں ہوگی
انہیں یہ غم کہ ان سے چھٹ کے دیوانوں پہ کیا گزری

یہ منظر کونسا منظر ہے پہچانا نہیں جاتا
سیہ خانوں سے کچھ پوچھو، شبستانوں پہ کیا گزری

چلو وہ کفر کے گھر سے سلامت آ گئے لیکن
خدا کی مملکت میں سوختہ‌جانوں پہ کیا گزری

شاد عارفی

بنا پائی نہ ذرّے کو نگینا
تو پھر مصرف ترا اے چشم بینا

سرھانے کوئی رکھ جاتا ہے مینا
خدا کا نام لینا اور پینا

نظر ہے اور تماشاے بد و نیک
بری اچھی سبھی پڑتی ہے پینا

پسیجا ہے بتوں کا دل ہمیں پر
یہیں پتھر کو آیا ہے پسینا

نگینہ ہے دل برباد الفت
مگر جو ٹوٹ جائے وہ نگینا

حجاب آلودہ رخسارِ جوانی
دیا پھولوں کو شبنم نے پسینا

جہاں اندھے، ادب کے پاسبان ہوں
وہاں کیا ”عرض جوہر“ کا قرینا

کہاں ہیں تجربہ کارانِ خلوت
دھڑکتا ہے مرا دل اس کا سینا

مرا مسلک ہے صلح و آشتی **شاد**
کمینہ ہے جو رکھے مجھ سے کینا

سیف الدین سیف

جھوٹے ہیں سب وعدے جھوٹے
بن کر لاکھ سہارے ٹوٹے

اٹھی ہے موجِ غمِ دنیا
اے غمِ جاناں ساتھ نہ چھوٹے

تری خاموشی نے تراشے
کتنے فسانے سچے جھوٹے

یہ سوناپن، یہ ویرانی
کس نے دل کے خزانے لوٹے

اے دل تیری بساط ہی کیا ہے
چند سہارے وہ بھی جھوٹے

دنیا والے سچ کہتے تھے
ہم بھی جھوٹے تم بھی جھوٹے

انجم رومانی

ترا خیال اسے کس قدر ہے، کیا کہیے
فریب خوردہ اگر ہے، بشر ہے، کیا کہیے

ہمیں بھی وضع کوئی اختیار کرنا ہے
ہمیں بھی علم ہو مدنظر ہے، کیا کہیے

اگر کوئی یہ کہے شب سحر ہے، چپ رہیے
مگر یہ نقطۂ اہل نظر ہے، کیا کہیے

گلوں پہ دامن گلچیں کا حق ہے، کیوں نہ چنے
بہار حسرتی برگ و بر ہے، کیا کہیے

قدم، گزیدۂ نقش قدم ہے، کیوں نہ رکے
سفر، بہ منزلِ خوابِ سفر ہے، کیا کہیے

وہی سراب، وہی بے کنار ویرانی
اگر نہ کہیے کہ دشت اپنا گھر ہے، کیا کہیے

نشانِ حسرتِ تعمیر کیا ہے، کیا لکھیے
بیانِ خامشیِ بام و در ہے، کیا کہیے

ہر ایک حرف ہے آشوبِ گوش، کیا سنئیے
ہر ایک لفظ دلِ نوحہ گر ہے، کیا کہیے

وہی شکایتِ قلب و نظر ہے، کیا کہیے
وہی حکایت عیب و ہنر ہے، کیا کہیے

نشاطِ کشمکشِ مستقل بیان کرتے
بساطِ عمر بہت مختصر ہے، کیا کہیے

قفس، قفس ہی سہی، درس گاہ شوق تو ہے
نفس، نفس ہوس بال و پر ہے، کیا کہیے
فغاں سے تنگ، نہ سیل بلا سے خانہ خراب
دل ایک بادشہ بحر و بر ہے، کیا کہیے
نگاہ شوق کی گستاخیوں کا ذکر نہیں
وفور جلوہ وہاں پردہ در ہے، کیا کہیے
گر اہل دل کوئی ہوتا تو ہم بھی کچھ کہتے
ہجوم انجم و شمس و قمر ہے، کیا کہیے

رواں دواں ہیں، قدم بے ارادہ رکھتے ہیں
عجب سفر ہے کہ منزل نہ جادہ رکھتے ہیں
بہ ہر نگاہ، سر استفادہ رکھتے ہیں
گدائے حسن ہیں، دامن کشادہ رکھتے ہیں
قبا و جبہ و دستار کی ہوس ہے کسے
یہی بہت ہے کہ دلق و لبادہ رکھتے ہیں
ہوائے کوچہ جاناں مگر اڑا لے جائے
امید، صورت برگ فتادہ رکھتے ہیں
کھلا یہ باعث آشفتگی و ناکامی
کہ ظرف دل سے تمنا زیادہ رکھتے ہیں

سنو، اگر کبھی رنگینیوں سے فرصت ہو
کہ ہم بھی چند حکایت سادہ رکھتے ہیں

ہیں ایک زاهد خشک اپنے وقت کے انجم
یہ اور بات کہ دل رہن بادہ رکھتے ہیں

قتیل شفائی

تمہاری انجمن سے اٹھ کے دیوانے کہاں جاتے
جو وابستہ ہوے تم سے وہ افسانے کہاں جاتے

نکل کر دیر وکعبہ سے اگر ملتا نہ بتخانہ
تو ٹھکرائے ہوے انسان خدا جانے کہاں جاتے

تمہاری بے رخی نے لاج رکھ لی بادہ خانے کی
تم آنکھوں سے پلا دیتے تو پیمانے کہاں جاتے

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے

قتیل اپنا مقدر غم سے بیگانہ اگر ہوتا
تو پھر اپنے پرائے ہم سے پہچانے کہاں جاتے

مجید امجد

جنون عشق کی رسم عجیب کیا کہنا
میں ان سے دور وہ میرے قریب کیا کہنا

یہ تیرگئی مسلسل میں ایک وقفہ نور
یہ زندگی کا طلسم عجیب کیا کہنا

جو تم ہو برق نشیمن، تو میں نشیمن برق
الجھ پڑے ہیں ہمارے نصیب کیا کہنا

ہجوم رنگ فراواں سہی مگر پھر بھی
بہار، نوحۂ صد عندلیب کیا کہنا

ہزار قافلہ زندگی کی تیرہ شبی
یہ روشنی سی افق کے قریب کیا کہنا

لرز گئی تیری لو میرے ڈگمگانے سے
چراغ گوشہ کوے حبیب کیا کہنا

مختار صدیقی

تھی تو سہی پر آج سے پہلے ایسی حقیر و فقیر نہ تھی
دل کی شرافت، ذہن کی جودت، اتنی بڑی تقصیر نہ تھی

سچ کہتے ہو، ہم ایسے کہاں، اور سوز و گداز عشق کہاں
سچ ہے میرے آئینہ دل میں کوئی کبھی تصویر نہ تھی

اب جو اچاٹ ہوئی ہے طبیعت، شاید اب ہم رخصت ہیں
بن کارن، بے بات وگرنہ، ایسی کبھی دلگیر نہ تھی

اہل جنوں کو فصل خزاں سے اب کے بھی گو نہ ربط رہا
اب کے بہار وہ آئی کہ جس کی بوئے گل بھی سفیر نہ تھی

آخر غیرت نے سمجھایا، نومیدانہ زیست کریں
باقی ہر تدبیر تو کی، جو اپنے خلاف ضمیر نہ تھی

ظہیر کاشمیری

جب کبھی تذکرۂ شعلہ رُخاں ہوتا ہے
دامنِ دل پہ سلگنے کا گماں ہوتا ہے

ہم سمن پوشوں میں اس طرح رہے آشفتہ
جس طرح شام کو باغوں میں دھواں ہوتا ہے

دل بیاباں میں الاؤ کی طرح جلتے ہیں
خیمہ‌زن قافلہ گشتہ سراں ہوتا ہے

اس کی ہر تان سے ملتا ہے ستاروں کو گداز
عشق کہتے ہیں جسے نغمہ جاں ہوتا ہے

دل مرحوم تمنا پہ دمکتے ہوئے داغ
جیسے تربت پہ چراغوں کا سماں ہوتا ہے

دعوت جلوۂ شب تاب پہ مسرور نہ ہو
یہ بھی اک وعدۂ زریں کمراں ہوتا ہے

حسن کا عکس بھی تسکین دل و جاں ہے ظہیر
حسن پر سایہ صاحب نظراں ہوتا ہے

شہرت بخاری

ہم پی گئے سب ہلے نہ لب تک
جی ہار گئے نجوم شب تک

ہرچند گھٹائیں چھٹ گئی ہیں
پر دل پہ غبار سا ہے اب تک

خوش ہو نہ زمانہ میرے غم پر
آئے گا یہ دور جام سب تک

اشکوں نے فسانہ کر دیا ہے
وہ لفظ کہ آ سکا نہ لب تک

ہر غم کو اڑا دیا ہنسی میں
تم پیش نظر رہے ہو جب تک

مے خانے میں سر چھپائیں آؤ
وا ہو در کعبہ جانے کب تک

شہرت کوئی اور بات چھیڑو
الٹیں وہ نقاب لطف جب تک

ناصر کاظمی

سفر منزل شب یاد نہیں
لوگ رخصت ہوئے کب یاد نہیں

اولیں قرب کی سرشاری میں
کتنے ارماں تھے جو اب یاد نہیں

دل میں ہر وقت چبھن رہتی تھی
تھی مجھے کس کی طلب یاد نہیں

وہ ستارہ تھی، کہ شبنم تھی، کہ پھول
ایک صورت تھی عجب یاد نہیں

کیسی ویراں ہے گزرگاہ خیال
جب سے وہ عارض و لب یاد نہیں

بھولتے جاتے ہیں ماضی کے دیار
یاد آئیں بھی تو سب یاد نہیں

ایسا الجھا ہوں غم دنیا میں
ایک بھی خواب طرب یاد نہیں

یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں

رشتۂ جاں تھا کبھی جس کا خیال
اس کی صورت بھی تو اب یاد نہیں

یاد ہے سیر چراغاں ناصر
دل کے بجھنے کا سبب یاد نہیں

(میر)

مثنوی نسنگ نامہ

پاؤ توفیق ٹک تو سر کو وضو
یہ بھی اک سانحہ ہے میر سنو

ہم کو در پیش تب سفر آیا
جب کہ برسات سر ہی پر آیا

ابر ہونے لگے سفید و سیاہ
پانی رستوں میں کیچ ساری راہ

بیچ میں ہوتے کچھ اگر اسباب
منھ اٹھانے کی جی میں ہوتی تاب

سو تو کمل ، نہ پٹو نہ لوئی
سایہ گستر نہ ابر بن کوئی

شب کہ دریا پہ ہو کے راہ پڑی
پانی کی سطح پر نگاہ پڑی

لجے لطمے کا کیا کہوں میں اوج
باتیں کرتی ہے آسماں سے موج

ہوش جاتا تھا دیکھ جوش آب
گوش کرتا تھا گر خروش آب

آب تہ دار اور تیرہ بہت
لہر اٹھتی جو تھی سو خیرہ بہت

پانی پانی تھا شور سے طوفان
دیکھ دریا کو سوکھتی تھی جان

ناو میں پاؤں ہم نے بارے رکھا
خوف کو جان کے کنارے رکھا

جب کہ کشتی رواں ہوئی واں سے
جسم گویا کہ تھا نہ تھی جاں سے

موجہ اٹھنے لگا جو طوفاں زا
لجہ آیا نظر سو عماں زا

کیا کہیں ڈوب ہی چلے تھے ہم
ناخدائی خدا نے کی اس دم

بلی لگتی نہ تھی نہ کچھ تھی تھاہ
عقل گم کردہ لوگ تھے ہمراہ

ریلا پانی کا جب کہ آتا تھا
خوف سے جی ہی ڈوبا جاتا تھا

خطر غرق سے تھی طاقت طاق
بے خودی سے ہوا تھا استغراق

بد بلا سے تھے ہم کنار ہوے
تھا خدا ہی تو بلی پار ہوے

کسی درویش کا تھا یمن قدم
جا کے پہنچے جو اس کنارے ہم
ورنہ اعمال نے ڈبویا تھا
گوہر جاں سے ہاتھ دھویا تھا
اس کنارے کا جو اثر پایا
ہم طلاتم کشوں میں جی آیا
اس طرف اترے آب کے جا کر
میر اور پیر صاحب اور چاکر
شکر لب پر دلوں سے محو گلا
کس و ناکس سبھوں سے خضر ملا
پار کا گنج تھا جو شاھدرا
سب نے رھنا وھیں کا جی میں دھرا
فاصلہ ایک کوس کا تھا بیچ
راہ یاں سے تھی واں تلک سب کیچ
تھے بہت بیچ میں نشیب و فراز
پہونچے واں شام کھینچ رنج دراز
سونہ جاگہ تھی نہ مکاں بسیت
چار دوکانیں ایک پھوٹی مسیت
جا کے حیراں ہوے کدھر جاویں
سر گھیسڑیں جو ٹک جگہ پاویں

تگ دو ہر طرف لگے کرنے
تسپہ پڑتے تھے مینہ کے بھرنے
کوئی میداں میں کوئی چھپر میں
کوئی در میں کوئی کسو گھر میں
گھر ملا صاحبوں کو ایسا تنگ
جس سے بیت الخلا کو آوے ننگ
بیٹھنے دیں نہ جب کہ صاحب کو
کون پوچھے نفر مصاحب کو
ڈھونڈتے ڈھونڈتے سرا پائی
ویسے گھر چھوٹے ویسی جا پائی
رہنا بٹھیاری کے غنیمت جان
جو کہا ان نے ہم سب گئے مان
کچھ پکانے کا جب سوال کیا
میں نے اظہار اپنا حال کیا
یاں جو لائے ہیں مجھکو اپنے ساتھ
زندگانی میری ہے ان کے ہاتھ
پہنچے ہے ان کے روبرو سے طعام
صبح کا صبح مجھ کو شام کا شام
جو کچھ آیا سو کھا لیا میں نے
کچھ رہا سو اٹھا دیا میں نے

سن کے اک دل سے کھینچی اس نے آہ
اور بولی کہ واہ صاحب واہ

ہم تو جانا تھا آدمی ہو بڑے
چار پانچ آدمی ہیں پاس کھڑے

کچھ یہ کھاوینگے کچھ کھلا وینگے
ہم کچھ ان کے سبب سے پاوینگے

سو تو نکلے ہو کورے بالم تم
ہو گدا جیسے شاہ عالم تم

صدقے ہیں ایسے بھی اتارے کے
سو گئے بخت گھر ہمارے کے

میں کہا مہترانی جی کچھ لو
مجھ سے آزردہ دل نہ اتنی ہو

بعضے آتے ہیں کچھ کھلاتے ہیں
بعضے مجھ سے بھی آتے جاتے ہیں

بارے جوں توں ہوئی وہ رات تمام
صبح کو صاحبوں کا ٹھہرا مقام

یہ بھی دن شب ہوا سحر تھا کوچ
غازی آباد کو گئے سب پوچ

راہ طے کر سرا میں جا اترے
کچھ ستم دیدہ پاس آ اترے

صاحب اترے حویلی میں آ کر
باغ میں اسکے سب نفر چاکر
اس بھی منزل میں ایک روز رہے
گزرے جس طور کوئی کس سے کہے
واں سے میرتھ سبھوں کی تھی منزل
کیچ پانی اگرچہ تھا حائل
گرتے پڑتے پہنچ گئے سارے
ہم جفاے سپہر کے مارے
واں سے لاوڑ نسنگ پھر واں سے
جا کے واں تنگ آ گئے جاں سے
کھنڈر سے اس میں تین چار مکان
جنکا گرنے پہ سخت ہے میلان
باؤ سی دن کو سائیں سائیں کرے
رات ہووے تو بھائیں بھائیں کرے
گر شکستہ ہوئی کہیں دیوار
بے زری سے بنانا ہے دشوار
ھفتہ ھفتہ تلک پڑی ہے خراب
پردہ کاھے کا پھر ہے رفع حجاب
کار پردازوں کو تقید ہے
شور ہے گالی ہے تشدد ہے

وے بچارے بہانے کرتے ہیں
رات دن لوگ چوکی بھرتے ہیں

کہتے ان سے تو یہ ملے ہے جواب
کس کے گھر سے بناویں لا کے شتاب

ہم کو کھانے ہی کا تردد ہے
صبح بقال کا تشدد ہے

بنیا منھ کو چھپائے جاتا ہے
روٹی کا فکر کھائے جاتا ہے

کس کو موسیں کہاں سے کچھ لاویں
دال آٹا جو تم کو پہنچاویں

تم کہو دال ماش کی ہے زبوں
یاں بہم پہنچے ہے جگر ہو خوں

تم کہو آٹا کرکرا کھایا
یاں کلیجہ چھنا تو ھاتھ آیا

فصل ہونے ابھی نہیں پائی
پیشگی سب سے قرض لے کھائی

جس سے چھُوٹے ہوے ہیں ہم دس بار
چوٹتا وہ کہے ہے ساھوکار

ماش کی دال کا نہ کریلے گلا
گوشت یاں ہے کبھو کسو کو ملا

جی اگر چاھے کوئی ترکاری
گول کدو ملے بصد خواری

گھاس ھی گھاس اس مکاں میں تمام
تس میں لساع جانور اقسام
جیسے زنبور زرد ایسے ڈانس
کاٹ کھاویں تو اچھلو دو دو بانس
پشہ و کیک اور کتّی تھی
جن کے کاٹے اچھلتی پتی تھی
ھاتھ پنڈوں پہ سب چلے جاتے
شبگزوں سے بدن جلے جاتے
ان کے کاٹے بدن پہ دانا ہے
مرچ جدوار پھر لگانا ہے
ایک دو دن جلا فراغ ھوا
اسکی جاگہ سیاہ داغ ھوا
نہ کھجاتے سارے گھسے
چھپٹے چھپٹے ھوے جو دانے پسے
دن کو وہ صورت طعام ھوئی
رات کو نیند یوں حرام ھوئی
کتوں کے چاروں اور رستے تھے
کتے ھی واں کہے تو بستے تھے
دو کہیں تھے کھڑے کہیں بیٹھے
چار لوگوں کے گھر میں جا بیٹھے
ایک نے پھوڑے باسن ایکو نے
کھود مارے گھروں کے سب کونے

کوئی گھورا کرے کوئی بھونکے
خفتہ خفتہ بھی شور سے چونکے

گلہ گلہ گھروں میں پھرنے لگے
روٹی ٹکرے کی بو پہ گرنے لگے

ایک نے آ کے دیگچا چاٹا
ایک آیا سو کھا گیا آٹا

ایک نے دوڑ کر دیا پھوڑا
پھر پیا آ کے تیل گر چھوڑا

گھر میں چھینکے اگر تھے توڑ دیے
هانڈی باسن گرا کے پھوڑ دیے

لوگ سوتے ہیں کتے پھرتے ہیں
لڑتے ہیں دوڑتے تھے گرتے ہیں

ایک هڈی پہ چار چار لڑیں
گوشت پر بھیڑے سے دوڑ پڑیں

جاگتے هو تو دو بدو کتے
سو کر اٹھو تو روبرو کتے

باهر اندر کہاں کہاں کتے
بام و در چھت جہاں تہاں کتے

جھر جھرا دے ہے کان کو کوئی
رو دے ہے اپنی جان کو کوئی

اک طرف سے چپڑ چپڑ کی صدا
یعنی کتا ہے چکی چاٹ رہا

ایک چھنے کو منھ میں لے آیا
ایک چولھے کو کھودتا پایا
ایک لے منھ میں هانڈی هے کالی
ایک نے چلنی چاٹ هے ڈالی
تیل کی ایک کپی لے بھاگا
ایک چکنے گھڑے سے جا لاگا
آدمی کی معاش هو کیوں کر
کتوں میں بود باش هو کیوں کر
بستی دیکھی سو ایسی تھی آباد
کہ بیاباں سخت سے دے یاد
چار چھپر کہیں چماروں کے
سو بھی ٹوٹے گرے بچاروں کے
پھوٹی ٹوٹی کوئی حویلی هے
سو بھی میدان میں اکیلی هے
اور جو چار گھر نظر آئے
ان کی خوبی کھلے وهیں جائے
وہ بھی کولی چار تھے کوئی
فاقوں کے زیر بار تھے کوئی
صورتیں کالی سوکھے سوکھے سے
سارے کنگال اور بھوکے سے
چار دانوں کے واسطے جی دیں
جان کھا جائیں کچھ نہ جب تک لیں

اور آگے گئے تو تھا بازار
اسمیں بنیوں کی تھیں دکانیں چار
ایک کے پاس دال کچھ آٹا
تس کو بھی مکھیوں نے تھا چاٹا
ایک کے سانواں اور تھوڑے چنے
چھپڑوں میں خاک دھول ایک کنے
تھا جو باقی رہا سو تھا کنگال
ناؤں کو کہتے تھے اسے بقال
ایک کنجرے کے چار گٹّھی پیاز
تسپہ اسکو ہزار فخر و ناز
کیا کہوں مرچ تھی نہ ادرک تھی
اس مچھندر میں کچھ بھی بھدرک تھی
ایک دوکان تھی پساری کی
اسنے ہم لوگوں سے بہی یاری کی
اس سے جا کر جو مانگئے ہلدی
زرد مٹی کو باندھ دے جلدی
دیکھ کر کچھ کہو تو وہ یہ کہے
بس تم اس بستی میں میاں جی رہے
یاں جو کچھ ہے چلن سو دیتا ہوں
میں بھی پیسے لگا کے لیتا ہوں
مانگو اس سے جو مرچ یا دھنیا
دیوے لچا وھیں بنا دھنیا

اس میں دو دانے اور سب کنکر
دیے کاغذ میں ہاتھ لمبا کر
لونگ چورا نفر سے منگوایا
لال مرچیں کٹی ہوئی لایا
اور اشیا یہیں سے کریے قیاس
آگے جاتا نہیں کہا مجھ پاس
اور دس بیس گھر گنواروں کے
اور دو چار فاقہ ماروں کے
پھوٹی مسجد خطیب تھا نہ اذان
یہی خانہ خطیب کا تھا واں
نہ تھی قدر صلواۃ و رسم صوم
اس پہ سید امام واں کی قوم
ایک تکیہ نہ جسمیں فرش کاہ
حال درویش قابل صد آہ
ٹکڑے ٹکڑے کی احتیاج اسکو
مرض جوع لاعلاج اسکو
برسوں چلّا کے نا امید ہوا
چپکی سادھی جگر میں چھید ہوا
آتے جاتے سے اسنے جو پایا
اسی پر رہ گیا وہی کھایا
آس پاس اس گڑھی کے آئی جھیل
گم تھے برسات میں طریق و سبیل

اس سے واں کی ہوا بہت مرطوب
هووے نزلہ زکام بے اسلوب

کتنے زوروں میں ہوتی ھے کھانسی
ایسے جیسے گلے میں دیں پھانسی

پڑی آفت خطر تھا سکھوں کا
کیونکہ وہ ملک گھر تھا سکھوں کا

اس میں آ جاتے تو قیامت تھی
مال و جاں غرض سبکی رخصت تھی

نہ کوئی داد رس نہ وقت داد
مفت ھی ھم گئے تھے سب برباد

کیا کڈھب چرخ کج نے پھنکا تھا
پر خدا کچھ ھمارا سیدھا تھا

جس نے قدرت نمائی کی اپنی
اس بلا سے رھائی کی اپنی

مثنوی سحرالبیان

میر حسن

خوشی سے پلا مجھ کو ساقی شراب
کوئی دن میں بجتا ھے چنگ و رباب

کروں نغمۂ تہنیت کو شروع
کہ اک نیک اختر کرے ھے طلوع

گئے نو مہینے جب اس پر گذر
هوا گھر میں شه کے تولد پسر

عجب صاحب حسن پیدا هوا
جسے مہر و مه دیکھ شیدا هوا

نظر کو نهو حسن پر اس کے تاب
اُسے دیکھ بیتاب هو آفتاب

هوا وه جو اس شکل سے دلپذیر
رکھا نام اس کا شۂ بے نظیر

خواصوں نے خواجه سراؤں نے جا
کئی نذریں گذرانیاں اور کہا

مبارک تجھے اے شه نیک بخت
که پیدا هوا وارث تاج و تخت

سکندر نژاد اور دارا حشم
فلک مرتبت اور عطارد رقم

رهے اس کے اقلیم زیر نگیں
غلامی کریں اس کی خاقان چین

یه سنتے هی مژده بچھا جا نماز
کئے لاکھ سجدے که اے بے نیاز

تجھے فضل کرتے نہیں لگتی بار
نهو تجھ سے مایوس امیدوار

دوگانه غرض شکر کا کر ادا
تہیه کیا شاه نے جشن کا

وہ نذریں خواصوں کی خوجوں کی لے
انہیں خلعت و زر کا انعام دے
کہا جاؤ جو کچھ کہ درکار ہو
کہو خانساماں سے طیار ہو
نقیبوں کو بلوا کے یہ کہہ دیا
کہ نقار خانے میں دو حکم جا
کہ نوبت خوشی کی بجاویں تمام
خبر سن کے یہ شاد ہوں خاص و عام
یہ مژدہ جو پہنچا تو نقارچی
لگا ہر جگہ بادلہ اور زری
بنا ٹھاٹھ نقار خانے کا سب
مہیا کر اسباب عیش و طرب
غلاف ان پہ بانات پُر زر کے ٹانک
شتابی سے نقاروں کو سینک سانگ
دیا زیر کو پہلے بم سے ملا
لگی پھیلنے ہر طرف کو صدا
کہا زیر نے بم سے بہر شگون
کہ دوں دوں خوشی کی خبر کیوں نہ دوں
بجے شادیانے جو واں اس گھڑی
ہوئی گرد و پیش آکے خلقت کھڑی
بہم مل کے بیٹھے جو شہنا نواز
بنا منہ سے پھر کی لگا اس پہ ساز

سروں پر وہ سر پیچ معمول کے
خوشی سے ہوئے گال گل پھول کے
لگے لینے اوپچیں خوشی سے نئی
ارانا لگا بجنے اور اس گھڑی
ٹکوروں میں نوبت کی شادی کی دھن
سگھڑ سننے والوں کو کہتے تھے سن
ترھئی اور قرنائے شادی کے دم
لگے بھرنے زیل اور کھرج میں بہم
سنی جھانج نے جو خوشی کی نوا
تھرکنے لگا تالیوں کو بجا
نئے سر سے عالم کو عشرت ہوئی
کہ لڑکے کے ہونے کی نوبت ہوئی
محل سے لگا تا بدیوان عام
عجب طرح کا اک ہوا اژدھام
چلے لے کے نذریں امیر و وزیر
لگے کھینچنے زر کے تودے فقیر
دیے شاہ نے شاہزادے کے ناؤں
مشائخ کو اور پیرزادوں کو گاؤں
امیروں کو جاگیر لشکر کو زر
وزیروں کو الماس ، لعل و گہر
خواصوں کو فوجوں کو جوڑے دیے
پیادے جو تھے ان کو گھوڑے دیے

خوشی سے کیا یاں تلک زر نثار
جسے ایک دینا تھا بخشے ہزار
کیا بھانڈ اور بھگتیوں نے ہجوم
ہوئی آہے آہے مبارک کی دھوم
لگا کنچنی چونہ پڑنے تمام
کہاں تک میں لوں نرت کاروں کے نام
جہاں تک کہ سازندے تھے ساز کے
دھنی دست کے اور آواز کے
جہاں تک کہ تھے گایت اور تنت کار
لگے گانے اور ناچنے ایک بار
لگے بجنے قانون و بین و رباب
بہار ہر طرف جوے عشرت کا آب
لگی تھاپ طبلوں کی مردنگ کی
صدا اونچی ہونے لگی چنگ کی
کماچوں کو سارنگیوں کو بنا
خوشی سے ہر اک اون کی تربین ملا
لگا موم تاروں پہ منہ چنگ کے
ملا سر طنبوروں کے مردنگ کے
ستاروں کے پردے بنا کر درست
بجانے لگے سب وہ چالاک و چست
گئی بائیں کی آسماں تک گمک
اٹھا گنبد چرخ سارا دھمک

خوشی کی ز بس ہر طرف تھی بساط
لگے ناچنے اسپہ اھل نشاط
کناری کے جوڑے چمکتے ہوے
وہ پانوؤں کے گھنگرو چھنکتے ہوے
وہ بالے چمکتے ہوئے کان میں
پھڑکنا وہ نتھنے کا ہر آن میں
وہ گھٹنا وہ بڑھنا اداؤں کے ساتھ
دکھانا وہ رکھ رکھ کے چھاتی پہ ہاتھ
کبھی دل کو پاؤں سے مل ڈالنا
نظر سے کبھی دیکھنا بھالنا
دکھانا کبھی اپنی چھب مسکرا
کبھی اپنی انگیا کو لینا چھپا
کسی کے چمکتے ہوے نور تن
کسی کے وہ مکھڑے پہ نتھ کی پھبن
وہ دانتوں کی مسی وہ گلبرگ تر
شفق میں عیاں جیسے شام و سحر
وہ گرمی تھی چہرے کی جوں آفتاب
جسے دیکھ کر دل کو ہو اضطراب
چمکنا گلوں کا صفا کے سبب
وہ گردن کے ڈورے قیامت غضب
کبھی منہ کے تئیں پھیر لینا ادھر
کبھی چوری چوری سے کرنا نظر

دوپٹے کو کرنا کبھی منہ کی اوٹ
که پردے میں ہوجاوے دل لوٹ پوٹ
ہر اک تان میں ان کو ارمان یہ
کہ دل لیجیے تان کی جان یہ
کوئی فن میں سنگیت کے شعلہ رو
پرم جوگ لچھمی کی لیے پر ملو
کوئی ڈھیٹ گت ہی میں پانؤں تلے
کھڑی عاشقوں کے دلوں کو ملے
کوئی دائرے میں بجا کر ہرن
کوئی دمدمے میں جتا اپنا فن
غرض ہر طرح دل کو لینا انہیں
نئی طرح سے داغ دینا انہیں
کبھی مار ٹھوکر کریں قتل عام
کبھی ہاتھ اٹھا لیویں گرتوں کو تھام
کہیں دھرپت اور گیت کا شور و غل
کہیں تول و قلیانہ و نقش و گل
کہیں بھانڈ اور لولیوں کا سماں
کہیں ناچ کشمیریوں کا وہاں
مجیرا پکھاوج گلے ڈال ڈول
بجاتے تھے اس جا کھڑے باندھ غول
محل میں جو دیکھا تو اک ازدحام
مبارک سلامت کی تھی دھوم دھام

پری پیکروں کا ہر اک جا ہجوم
وہاں بھی پڑی عیش عشرت کی دھوم

چھٹی تک غرض تھی خوشی ہی کی بات
کہ دن عید اور رات تھی شب برات

بڑھا ابر ہی ابر میں جو ہلال
محمل میں لگا پلنے وہ نونہال

برس گانٹھ جس سال اس کی ہوئی
دل بستگاں کی گرہ کھل گئی

وہ گل جب کہ چوتھے برس میں لگا
بڑھایا گیا دودھ اس ماہ کا

ہوئی تھی جو کچھ پہلے شادی کی دھوم
اسی طرح سے پھر ہوا واں ہجوم

طوائف وہی اور وہی راگ و رنگ
ہوئی بلکہ دونی خوشی کی ترنگ

وہ گل پانوں سے اپنے جس جا چلا
وہاں آنکھ کو نرگسوں نے ملا

لگا پھرنے وہ سرو جب پانوں پانوں
کیے بردے آزاد تب اس کے نائوں

مئے ارغوانی پلا ساقیا
کہ تعمیر کو باغ کی دل چلا

دیا شہ نے ترتیب اک خانہ باغ
ہوا رشک سے جس کے لالہ کو داغ
عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان
لگے جس میں زربفت کے سائبان
چھتیں اور پردے بندھے زرنگار
دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
کوئی ڈور سے در پہ اٹکا ہوا
کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا
وہ مقیش کی ڈوریاں سربسر
کہ مہ کا بندھا جس میں تار نظر
چقوں کا تماشا تھا آنکھوں کا جال
نگہ کو وہاں سے گذرنا محال
سنہری مغرق چھتیں ساریاں
وہ دیوار اور در کی گلکاریاں
دیے ہر طرف آئینے جو لگا
گیا چوگنا لطف اس میں سما
وہ مخمل کا فرش اس کا ستھرا کہ بس
بڑھے جس کے آگے نہ پائے ہوس
رہیں لخلخے اس میں روشن مدام
معطر شب و روز جس کے مشام
چھپرکھٹ مرصع کا دالان میں
چمکتا تھا اس طرح ہر آن میں

زمیں پر تھی اس طور اس کی جھمک
ستاروں کی جیسے فلک پر چمک
زمیں کا کروں اس کی کیا میں بیاں
کہ صندل کا اک پارچہ تھا عیاں
بنی سنگ مرمر سے چوپڑ کی نہر
گئی چار سو اس کے پانی کی نہر
قرینے سے گرد اس کے سرو سہی
کچھ اک دور دور اس سے سیب و بہی
کہوں کیا میں کیفیت دار بست
لگائے رہیں تاک واں مے پرست
ہوائے بہاری سے گل لہلہے
چمن سارے شاداب اور ڈہڈہے
زمرد کے مانند سبزے کا رنگ
روش پر جواہر لگا جیسے سنگ
روش کی صفائی پہ بے اختیار
گل اشرفی نے کیا زر نثار
چمن سے بھرا باغ گل سے چمن
کہیں نرگس و گل کہیں یاسمن
چنبیلی کہیں اور کہیں موتیا
کہیں رائے بیل اور کہیں موگرا

کھڑے شاخ شبو کے ہر جا نشان
مدن بان کی اور ہی آن بان
کہیں ارغواں اور کہیں لالہ زار
جدی اپنے موسم میں شب کی بہار
کہیں جعفری اور گیندا کہیں
سماں شب کو داؤدیوں کا کہیں
عجب چاندنی میں گلوں کی بہار
ہر اک گل سفیدی سے مہتاب دار
کھڑے سرو کی طرح چنبے کی جھاڑ
کہے تو کہ خوشبوئیوں کے پہاڑ
کہیں زرد نسریں کہیں نسترن
عجب رنگ کے زعفرانی چمن
پڑے آب جو ہر طرف کو بہے
کریں قمریاں سرو پر چہچہے
گلوں کا لب نہر پر جھومنا
اسی اپنے عالم میں منہ چومنا
وہ جھک جھک کے گرنا خیابان پر
نشے کا سا عالم گلستان پر
لیے ہاتھ میں بیلچے مالنیں
چمن کو لگیں دیکھنے بھالنیں
کہیں تخم پاشی کریں گود کر
پنیرے جماویں کہیں کھود کر

کھڑے شاخ در شاخ باہم نہال
رہیں ہاتھ جوں مست گردن میں ڈال
لب جو پہ آئینے میں دیکھ قد
اکڑنا کھڑے سرو کا جد نہ تد
خراماں صبا صحن میں چار سو
دماغوں کو دیتی ہر اک گل کی بو
کھڑے نہر پر قاز اور قرقرے
لیے ساتھ مرغابیوں کے پرے
صدا قرقروں کی بطوں کا وہ شور
درختوں پہ بگلے منڈیروں پہ مور
چمن آتش گل سے دہکا ہوا
ہوا کے سبب باغ مہکا ہوا
صبا جو گئی ڈھیریاں کرکے پھول
پڑے ہر طرف مولسریوں کے پھول
وہ کیلوں کی اور مولسریوں کی چھائنوں
لگی جائیں آنکھیں لیے جس کا نائنوں
خوشی سے گلوں پر سدا بلبلیں
تعشق کی آپس میں باتیں کریں
درختوں نے برگوں کے کھولے ورق
کہ لیں طوطیاں بوستاں کا سبق
سماں قمریاں دیکھ اس آن کا
پڑھیں باب پنجم گلستان کا

ددا دائیاں اور مغلانیاں
پھریں ہر طرف اس میں جلوہ کناں
خواصوں کا اور لونڈیوں کا ھجوم
محل کی وہ چہلہیں وہ آپس کی دھوم
تکلف کے پہنے پھریں سب لباس
رھیں رات دن شہزادے کے پاس
کنیزان مہرو کی ہر طرف ریل
چنبیلی کوئی اور کوئی رائے بیل
رنگیلی کوئی اور کوئی سیام روپ
کوئی چت لگن اور کوئی کام روپ
کوئی کیتکی اور کوئی گلاب
کوئی مہر تن اور کوئی ماھتاب
کوئی سیوتی اور ھنس مکھ کوئی
کوئی دل لگن اور تن سکھ کوئی
ادھر اور ادھر آتیاں جاتیاں
پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں
کہیں اپنے پٹے سنوارے کوئی
اری او سہیلی پکارے کوئی
کہیں چٹکیاں اور کہیں تالیاں
کہیں قہقہے اور کہیں گالیاں
بجاتی پھرے کوئی اپنے کڑے
کہیں واہ وا اور کہیں وا چھڑے

دکھاوے کوئی گوکھرو موڑ موڑ
کہیں سوت بوئے کہیں تار توڑ
ادا سے کوئی بیٹھی حقہ پیے
دم دوستی کوئی بھر بھر جیے
کوئی حوض میں جاکے غوطہ لگائے
کوئی نہر پر پانئوں بیٹھی ہلائے
کوئی اپنے طوطے کی لیوے خبر
کوئی اپنی مینا پہ رکھے نظر
کسی کو کوئی ڈھول مارے کہیں
کوئی جان کو اپنی وارے کہیں
کوئی آرسی اپنے آگے دھرے
ادا سے کوئی بیٹھی کنگھی کرے
مقابہ کوئی کھول مسی لگائے
لبوں پر دھڑی کوئی اپنے جمائے
ہوا ان گلوں سے دوبالا سماں
اسی باغ میں تھا وہ سرو رواں
غرض لوگ تھے یہ جو ہر کام کے
یہ سب واسطے اس کے آرام کے
پلا جب وہ اس ناز و نعمت کے ساتھ
پدر اور مادر کی شفقت کے ساتھ
ہوئی اس کے مکتب کی شادی عیاں
ہوا پھر انھیں شادیوں کا سماں

معلم اتالیق منشی ادیب
ہر اک فن کے استاد بیٹھے قریب
کیا قاعدے سے شروع کلام
پڑھانے لگے علم اس کو تمام
دیا تھا ز بس حق نے ذہن رسا
کئی سال میں علم سب پڑھ چکا
معانی و منطق بیان و ادب
پڑھا اس نے منقول و معقول سب
خبردار حکمت کے مضمون سے
غرض جو پڑھا اس نے قانون سے
لگا ہیئت و ہندسہ تا نجوم
زمیں آسماں میں پڑی اس کی دھوم
کیے علم نوک زبان حرف حرف
اسی نحو سے اس نے کی عمر صرف
عطارد کو آنے لگی اس کی ریس
ہوا سادہ لوحی میں وہ خوش نویس
ہوا جب کہ نو خط و شیریں رقم
بڑھا کر لکھے سات سے نو قلم
لیا ہاتھ جب خامۂ مشکبار
لکھا نسخ و ریحاں و خط غبار
عروس الخطوط اور ثلث و رقاع
خفی اور جلی مثل خط شعاع

شکستہ لکھا اور تعلیق جب
رہے دیکھ حیران اتالیق سب
کیا خط گلزار سے جب فراغ
ہوا صفحہ قطعہ گلزار باغ
کروں علم اس کا کہاں تک بیاں
کہ ہے خوب اب مختصر یہ بیاں
کماں کے جو در پے ہوا بے نظیر
لیا کھینچ چلّے میں سب فن تیر
صفائی میں سوفار پیکاں کیا
گیا جب کہ تودے پہ طوفان کیا
رکھا چھوٹتے ہی جو لکڑی پہ من
کیا اپنے قبضہ میں سب اس کا فن
ہوئی دست بازو کی سرسائیاں
اوڑائیں کئی ہاتھ میں گھائیاں
رکھا موسقی پر جو کچھ کچھ خیال
کیے قید سب اس نے ہاتھوں میں تال
طبیعت گئی کچھ جو تصویر پر
رکھے رنگ سب اس کے مد نظر
کئی دن میں سیکھا یہ کسب تفنگ
کہ حیراں ہوئے دیکھ اہل فرنگ
سوا ان کمالوں کے کتنے کمال
مروت کی خو آدمیت کی چال

رذالوں سے نفروں سے نفرت اسے
سدا قابلوں سے تھی صحبت اسے
گیا نام پر اپنے وہ دل پذیر
ہر اک فن میں سچ مچ ہوا بے نظیر

نظر آئی واں چاندنی کی بہار
کہ آنکھوں نے کی خیرگی اختیار
در و بام یک لخت سارے سپید
ہر اک طاق محراب صبح امید
مغرق زمیں پر تمامی کا فرش
جھلک جس کی لے فرش تا بعرش
زمیں کا طبق آسماں کا طبق
سنہرے روپہلے ہوں جیسے ورق
بلوریں دھرے ہر طرف سنگ فرش
کہ جس سے منور ہے رنگ فرش
گئی اس کے عالم پہ جس دم نگاہ
اور آئی نظر اس میں اک رشک ماہ
طرح اس کی ہر دل کو مانوس تھی
کہ گویا وہ شیشے کی فانوس تھی
کہیں دیکھ اس کے تئیں ہوشمند
پری کو کیا ہے گا شیشے میں بند

ہر اک سمت واں نور کا ازدحام
لگے آئینے قدِ آدم تمام
لپیٹے ہوے بادلوں سے درخت
زمین و ہوا صاحبِ تاج و تخت
ملبب وہ چوپڑ کی پاکیزہ نہر
پڑے چشمہ و ماہ سے جس میں لہر
لب نہر پر صاف جو غور کی
تو پٹری تھی وہ ایک بلور کی
پڑے اس میں فوارے چھٹتے ہوے
ہوا بیچ سے موتی لٹتے ہوے
مقرض پڑا اس میں مقیش جو
گرا ماہ واں رشک سے پرزے ہو
لیے گود مقیش چھوٹے بڑے
ہر اک جا ستارے اوڑاویں کھڑے
غرض اپنی صورت سے تاروں کو توڑ
زمیں کو فلک کا بنایا تھا جوڑ
ہوا میں وہ جگنو سے چمکیں بہم
ملیں جلوۂ مہ کو زیرِ قدم
فقط چاندنی میں کہاں طور یہ
کہ طرہ نہ جب تک ملے اور یہ
زمانہ زرافشاں ہوا زرفشاں
زمیں سے لگا تا سہا زرنشاں

گل و غنچہ زریں و تاج و خروس
زمینِ چمن سب جبینِ عروس

خراماں زری پوش ہر ماہوش
کریں دیکھ کر مہر و مہ جن کو غش

کھڑا ایک نمگیرۂ زر نگار
کہ تھے جس کی جھالر پہ موتی نثار

جڑاؤ دو استادے الماس کے
ڈھلے ایک سانچے کے اک راس کے

کھنچی ڈوری اک طرف زر تار کی
لڑی جوں کناری کے ہوں ہار کی

کہوں کیا میں جھالر کی اس کی پھبن
کہ سورج کے ہو گرد جیسے کرن

مغرق بچھی مسند اک جگمگی
کہ تھی چاندنی جس کے قدموں لگی

نہ پھولے سماتے تھے تکیے دھرے
کہ تھے وہ فقط حسن ہی سے بھرے

بلوریں صراحی وہ جام بلور
دل و دیدہ واقف تماشائے نور

چمن سارے داؤدیوں سے بھرے
جوانان شبو کے ہر جا پرے

ستاروں کا مہتاب میں جال یوں
کہ چونے کے پانی میں قطرے ہوں جوں

اگر کیجیے سایہ اوپر نگاہ
تو ہے وہ بھی جوں سایۂ مہر و ماہ
کرے ہے نگاہ جس طرف کو گذر
بجز نور آتا نہیں کچھ نظر

لگا پا سے وہ نازنیں تا بفرق
سراپا جواہر کے دریا میں غرق
پڑی پانوں میں کفش زریں نگار
ستاروں کی جس کی زمیں پر بہار
گٹھی ہوئی وہ ترکیب اور وہ بدن
وہ پوشاک و زیور کی اس پر پھبن
وہ چھب تختی اس کی نزاکت نہاد
چمن زار قدرت میں نخلِ مراد
بھری مانگ موتی سے جلوہ کناں
نمایاں شبِ تیرہ میں کہکشاں
وہ ماتھے پہ ٹیکے کی اس کے جھلک
سحر چاند تاروں کی جیسے چمک
ہوس ہو نہ دیکھ اس کے زیور کو پھر
کہے تو کہ ٹیکا تھا سب اس کے سر
وہ بالے کی تابندگیِ زیرِ گوش
جسے دیکھ اڑ جائیں بجلی کے ہوش

وہ ہیرے کا تکمہ بصد آب و تاب
وہ صبح گلو مطلع آفتاب
وہ تکیے پہ چنپا کلی کی پھبن
کہ سورج کے آگے ہو جیسی کرن
وہ چھاتی پہ الماس کی دھکدھکی
رہے آنکھ سورج کی جس پر جھکی
وہ موتی کے مالے لٹکتے ہوئے
رہیں دل جہاں سر پٹکتے ہوئے
و الماس کی ہیکل اک خوش نما
تصور رہے جس کا دل سے لگا
وہ بھُجبند بازو کے اور نورتن
کہ جوں گل سے ہو شاخ زیب چمن
وہ پہنچی زمرد کی اور دستبند
نزاکت میں تھی شاخِ گل سے دو چند
وہ لعلوں کی پازیب آویزہ‌دار
سدا اشک خونیں ہو جس پر نثار
وہ مینے کے پانوؤں میں چھلے تھے کل
کہ آنکھوں سے دل ان پہ کھاتے تھے گل
وہ بالوں کی بو رشکِ مشک ختن
وہ ڈوبا ہوا عطر میں پیرہن
زمیں سے معطّر ہوا تا فلک
زمانہ گیا اس کی بو سے مہک

کیا اس طرح سے جب اس نے سنگھار
ہوئے مہر و مہ اس کے منہ پر نثار
فلک تک گئی حسن کی اس کے دھوم
لیا ہاتھ مشاطہ نے اپنا چوم
خواصوں نے گھر کو دیا انتظام
تمامی کے پردے لگائے تمام
بچھا فرش اور کر چھپر کھٹ کو صاف
مرصّع کا اس پر اڑھا کر غلاف
وہ نرگس کے دستے جو آفاق میں
نہ نکلیں سو لا کر چلے طاق میں
ولایت کے میوے دھرے ہر طرف
کہ لے جاوے بو ان کی گل پر شرف
دھرے لخلخے خاص ایوان میں
ہوا ہو گئی عطر دالان میں
دھریں کیاریاں اک طرف بے شمار
چنی اک طرف ڈالیوں کی قطار
اچار اور مربّے دھرے خوش نما
وہ باہر کے دالان میں جا بجا
چھپر کھٹ کے پاس ایک مسند بچھا
اور اس پر تمامی کے تکیے لگا
چنگیریں بنا اور رکھ پاندان
قرینے سے اس میں رکھے ہار پان

کئی عطرداں واں مرصّع دھرے
انوکھی گڑھت کے کئی چو گھڑے
سرھانے مجلد دھری اک کتاب
ظہوری، نظیری کا کل انتخاب
دھری اک بیاض اور رشک چمن
پر از شعر سودا و میر حسن
قلمدان بھی اک نزاکت بھرا
قرینے سے زیرِ چھپر کھٹ دھرا
دھرا اک طرف گنجفہ خوش قماش
دھری چوپڑ اک طرف کو غم تراش
بچھی ایک چوکی پڑا تورہ پوش
کریں دیکھ کر غش جسے بادہ نوش
صراحی و ساغر شراب و کباب
دھرا اسپہ ساقی نے کر انتخاب
ولے اس کو رکھا چھپائے ہوئے
کہ چھٹتے نہیں منہ لگائے ہوئے
کہا خاصہ‌پز کو خبردار کر
کہ رکھیو تو خاصے کو تیار کر
یہ سب کچھ ہوا جب کہ آراستہ
خراماں ہوئی سروِ نوخاستہ
سر شام لے ہاتھ میں اک چھڑی
و لیکن چھڑی وہ کہ جگنوں جڑی

روش پر لگی پھرنے ایدھر ادھر
که چھپ جائے سورج اسے دیکھ کر

کئی دن نہ آیا جو وہ رشک مہ
نظر میں ھوا اس کی عالم سیاہ
لگی کہنے نجم‌النساء سے بوا
خدا جانے اس شخص کو کیا ھوا
کہا اس نے بی تم کو سودا ھے کچھ
وہ معشوق ھے اس کو پروا ھے کچھ
خدا جانے کس شغل میں لگ گیا
مری چڑ ھے اتنا بھی ھونا فدا
وہ رہ رہ کے تم کو دلاتا ھے چاہ
عبث آپ کو مت کرو تم تباہ
رکے جو کوئی اس سے رک جائیے
جھکے آپ سے اس سے جھک جائیے
تفول بھلا کچھ نکالا کرو
ذرہ آپ کو تم سنبھالا کرو
یہ سن چپ رھیں دل میں کہا پیچ وتاب
دیا پھر نہ اس بات کا کچھ جواب
گئے اس پہ جب دن کئی اور بھی
بگڑنے لگے پھر تو کچھ طور بھی

دوانی سی ہر طرف پھرنے لگی
درختوں میں جا جا کے گرنے لگے

ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب
لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب

تپ ہجر گھر دل میں کرنے لگی
دُرِ اشک سے چشم بھرنے لگی

خفا زندگانی سے ہونے لگی
بہانے سے جا جا کے سونے لگی

تپ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ
اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپ ڈھانپ

نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا
نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا

جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے
محبت میں دن رات گھٹنا اسے

کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو
تو اٹھنا اسے کہ کے ہاں جی چلو

جو پوچھا کسی نے کیا حال ہے
تو کہنا یہی ہے جو احوال ہے

کسی نے جو کچھ بات کی بات کی
یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی

کہا گر کسی نے کہ کچھ کھائیے
کہا خیر بہتر ہے منگوائیے

کسی نے کہا سیر کیجیے ذرا
کہا سیر سے سیر ہے دل مرا
جو پانی پلانا تو پینا اسے
غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے
نہ کھانے کی سدھ اور نہ پینے کی ہوش
بھرا دل میں اسے محبت کا جوش
چمن پر نہ مائل نہ گل پر نظر
وہی سامنے صورت آٹھوں پہر
نہفتہ اسی سے سوال و جواب
سدا روبرو اس کے غم کی کتاب
جو آ جائے کچھ ذکر شعر و سخن
تو پڑھنے یہ اشعار میر حسن

یہ کیا عشق آفت اٹھانے لگا
مرے دل کو مجھ سے چھڑانے لگا
ملا میرے دلبر کو مجھ سے خدا
نہیں تو مرا جی ٹھکانے لگا
گنہ چشم خونبار کا کچھ نہیں
مرا دل ہے مجھ کو ڈبانے لگا
فلک نے تو اتنا ہنسایا نہ تھا
کہ جس کے عوض یوں رلانے لگا

نہیں مجھ کو دشمن سے شکوہ حسن
مرا دوست مجھ کو ستانے لگا

غزل یا رباعی ہو یا کوئی فرد
اسی ڈھب کی پڑھنا کہ ہو جس میں درد

سو یہ بھی کہ مذکور نکلے کہیں
نہیں تو کچھ اس کی بھی خواہش نہیں

سبب یہ کہ دل سے تعلق ہے سب
نہو دل تو پھر بات بھی ہے غضب

گیا ہو جو اپنا ہی جیوڑا نکل
کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

عجب وقت ہے اور عجب ہے سماں
کرے دو گھڑی آ کے مجرا یہاں

خفا ہوں مرا جی تو مشغول ہو
کوئی دم تو داغ جگر پھول ہو

کسی طرح سے دل تو لگتا نہیں
جلے ہے جگر دل سلگتا نہیں

یہ سنتے ہی دوڑی گئی اک نگار
لیا عیش بائی کو اس نے پکار

وہ آنے لگی کافر اس آن سے
کہ جانے لگا جی مسلمان سے

عجب چال سے وہ چلی نازنیں
کہ مستی میں پانؤں کہیں کا کہیں
وہ خلقت کی گرمی وہ ڈومن پنا
نشے میں بھبھوکا سا چہرہ بنا
لٹیں منہ پہ چھوٹی ہوئیں سر بسر
کہ بدلی ہو جوں مہ کی ایدھر اودھر
وہ بن پونچھی ہونٹوں کی مسی غضب
کہ منہ پر تھی گویا قیامت کی شب
فقط کان میں ایک بالا پڑا
کہے تو کہ تھا مہ کے ہالا پڑا
وہ پشواز اگرئی وہ نرگس کے ہار
وہ کمخواب کے بند روسی ازار
بندھا سر پہ جوڑا پڑی زرد شال
کمر کی لچک اور مٹک کی وہ چال
وہ شبنم کی انگیا بنی تنگ چست
کناروں پہ مینا بنت کا درست
وہ اٹھی ہوئی حین پشواز کی
وہ مسکی ہوئی چولی انداز کی
وہ مہندی کا عالم وہ توڑے چھڑے
وہ پانؤں میں سونے کے دو دو کڑے
چلی واں سے دامن اٹھاتی ہوئی
کڑے کو کڑے سے بجاتی ہوئی

عجب ایک عالم تھا بے ساختہ
که عالم تھا اك اس په جاں باختہ

کئی کافریں اور بھی دل نواز
لئے ساتھ ساتھ اس کے سب اپنا ساز

چلیں ایک اغماز اور ناز سے
کھڑی واں ہوئیں ایک انداز سے

روش پر جو تھا فرش اس کے حضور
ادب سے وہاں بیٹھیاں مل کے دور

ہوا حکم گوری کا جو برملا
لئے ساز اپنے سبھوں نے اٹھا

دیا آسماں پر جو طبلوں کو کھینچ
ہر اک تھاپ میں دل لیا سب کا اینچ

لگی گانے پڑھ وہ اس آن سے
نکلنے لگی جان ہر تان سے

عجب تان پڑتی تھی انداز سے
که بیکل تھی ہر تان آواز سے

وہ تھی گٹکری یا لڑی نور کی
مسلسل تھی اک پھلجڑی نور کی

گل و غنچه کی طرح محبوب تھی
کھلی اور مُندی دل کو محبوب تھی

غرض کیا کہوں اس کا میں ماجرا
عجب طرح کی بندھ گئی تھی ہوا

وہ گانے کا عالم وہ حسن بیاں
وہ گلشن کی خوبی وہ دن کا سماں
گھڑی چار دن باقی اس وقت تھا
سہانا ہر اک طرف سایہ ڈھلا
درختوں کی کچھ چھانؤں اور کچھ وہ دھوپ
وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ
لپیٹے ہوئے پوستوں پر تمام
روپہلے سنہرے ورق صبح و شام
وہ لالے کا عالم ہزارے کا رنگ
وہ آنکھوں کے ڈورے نشے کا ترنگ
گلابی سے ہو جانا دیوار و در
درختوں سے آنا شفق کا نظر
وہ چادر کا چھپنا وہ پانی کا زور
ہر اک جانور کا درختوں پہ شور
وہ سرو سہی اور آب رواں
وہ پانی کا مستی سے بہنا وہاں
وہ اڑتی سی نوبت کی دھیمی صدا
کہیں دور سے گوش پڑتی تھی آ
وہ رقص بتاں اور سنہری الاپ
وہ گوری کی تانیں وہ طبلوں کی تھاپ
وہ دل پیسنا ہاتھ پر دھر کے ہاتھ
اچھلنا وہ دامن کا ٹھوکر کے ساتھ

نہ انسان کا دل ہوا اس میں بند
ہوے محو سن کر چرند اور پرند
غرض جو کھڑے تھے کھڑے رہ گئے
اڑے جس جگہ تھے اڑے رہ گئے
جو پیچھے تھے آگے نہ وہ چل سکے
جو بیٹھے سو بیٹھے نہ پھر ہل سکے
لگی دیکھنے آنکھ نرگس اٹھا
گلوں نے دیے کان ادھر کو لگا
لگے ہلنے آ وجد میں سب درخت
کھڑے رہ گئے سرد ہو کر کرخت
درختوں سے گرنے لگے جانور
بنے مثل آئینہ دیوار و در
ہوئیں قمریاں شوق سے نعرہ زن
بھرا اشک سے بلبلوں کے حسن
ہوے نہر کے سنگ پارے پگھل
بڑے سارے فوارے اس کے اچھل
عجب راگ کو بھی دیا ہے اثر
کہ ہو جاے پتھر کا پانی جگر
بندھا اس طرح کا جو اس جا سماں
ہوا سب کے دل کا عجب حال واں
و لیکن جو کچھ دل گیوں پر گیا
کہ بن آے ہر اک وہاں مر گیا

لگا تھا ز بس عشق کا اس کو تیر
لگی کھینچنے آہ بدر منیر

کدھر ہے تو اے ساقیٔ گلبدن
دھری آج اس شمع رو کی لگن
بلا مطربان خوش آواز کو
کہ آویں لیے اپنے سب ساز کو
وہ اسباب شادی کا تیار ہو
مکرر نہ پھر جس کی تکرار ہو
بڑی خواہشوں سے جب آیا وہ روز
چڑھا بیاہنے وہ مۂ دل فروز
محل سے نکل جب ہوا وہ سوار
بجے شادیانے بہم ایک بار
کروں اس تجمل کو کیوں کر عیاں
کہ باہر ہے تقریر سے یہ بیاں
وہ دولھا کے اٹھتے ہی اک غل پڑا
لگا دیکھنے اٹھ کے چھوٹا بڑا
کوئی دوڑ گھوڑوں کو لانے لگا
کوئی ہاتھیوں کو بٹھانے لگا
لگا کہنے کوئی ادھر آئیو
ارے رتھ شتابی مری لائیو

کسی نے کسی کو پکارا کہیں
نہ لانے پہ میانے کے مارا کہیں
کوئی پالکی میں چلا ہو سوار
پیادوں کی رکھ اپنے آگے قطار
جو کثرت میں دیکھا کہ گاڑی نہیں
کوئی مانگے تانگے میں بیٹھا کہیں
سپر اور قبضے کھڑکنے لگے
سواروں کے گھوڑے بھڑکنے لگے
ٹکورے وہ نوبت کے اور ان کے بعد
گرجنا وہ دھونسوں کا مانند رعد
وہ شہنائیوں کی سہانی دھنیں
جنھیں گوش زہرہ مفصل سنیں
ہزاروں تماسی کے تخت رواں
اور اہل نشاط ان پر جلوہ کناں
وہ طبلوں کا بجنا اور ان کی صدا
یہ گانا کہ اچھا بنا لاڈلا
وہ نوشہ کا گھوڑے پہ ہونا سوار
وہ موتی کا سہرا جواہر کے ہار
ٹھٹھک کر وہ گھوڑوں کا چلنا سنبھل
ہما کے وہ دونوں طرف مورچھل
وہ فانوسیں آگے زمرد نگار
کہ ہو سبز مینا جنھوں پر نثار

دو رستہ جو روشن چراغان سے
پڑھے شعر نوری کے دیوان سے
چراغوں کے تترلولیے جا بجا
اور ان میں وہ بازاریوں کی صدا
کوئی پان بیچے کھلونے کوئی
کوئی دال موٹھ اور سلونے کوئی
تماشائیوں کا جدا اک ہجوم
پتنگے کریں جوں چراغوں پہ جھوم
کڑکنا وہ نوبت کا باجوں کے ساتھ
گرجنا وہ دھونسوں کا دھوں دھوں کے ساتھ
براتی ادھر اور ادھر جوق جوق
وہ آواز قرنا وہ آواز بوق
وہ کالے پیادے وہ ان کی نفیر
کہ تا چرخ پہنچے صدا ان کی چیر
وہ آرائش اور گل کئی رنگ کے
وہ ہاتھی کہ دو دیو تھے جنگ کے
وہ ابرک کی ٹٹی وہ مینے کے جھاڑ
کہے تو کہ تنکے کے اوجھل پہاڑ
دو رستہ برابر برابر وہ تخت
کسی پر کنول اور کسی پر درخت
وہ رنگیں کنول اور شمع و چراغ
کھلے جس طرح لالۂ نور باغ

جہاں تک نظر آوے ان کی قطار
طلسمات کی سی ہوا پر بہار
اناروں کا دغنا بھچمپے کا زور
ستاروں کا چھٹنا پٹاخوں کا شور
اڑایا ستاروں کو جو آگ نے
تو ہاتھی لگے بن کو پھر بھاگنے
وہ مہتاب کا چھوٹنا بار بار
ہر اک رنگ کی جس سے دونی بہار
دھواں چھپ گیا نور میں نور ہو
سیاہی اڑی شب کی کافور ہو
سراسر وہ ہر طرف مشعل کے جھاڑ
کہ جوں نور کے مشتعل ہوں پہاڑ
زری پوش سردار سب یکدیگر
پھریں برق کی طرح ایدھر ادھر
کہے تو کہ نزدیک اور دور سے
زمین و زماں بھر گیا نور سے
جب آئی وہ دلہن کے گھر پر برات
کہوں واں کے عالم کی کیا تم سے بات
ہوا واں کی صحبت کی رشک بہشت
دھرے لخلخے گرد عنبر سرشت
کھڑے بادلوں کے وہ خیمے بلند
کریں عالم نور جس کو پسند

عجب مسند اک جگمگی اور فرش
تمامی کے عالم کا چوکور فرش
بلوریں دھرے شمعدان بے شمار
چڑھیں موم کی بتیاں چار چار
نئے رنگ کے اور نئے طور کے
دھرے ہر طرف جھاڑ بلور کے
تماشائیوں کی یہ کثرت تھی بس
لگے ایک سے ایک سب پیش و پس
دو زانوں زری پوش بیٹھے تمام
شراب خوشی کے کئے نوش جام
وہ دولھا کا مسند پہ جا بیٹھنا
برابر رفیقوں کا آ بیٹھنا

گلزار نسیم

پنڈت دیا شنکر نسیم

ہر شاخ میں ہے شگوفہ کاری
ثمرہ ہے قلم کا حمد باری
کرتا ہے یہ دو زباں سے یکسر
حمد حق و مدحت پیمبر
پانچ انگلیوں میں یہ حرف زن ہے
یعنی کہ مطیع پنجتن ہے
ختم اس پہ ہوئی سخن پرستی
کرتا ہوں زباں کی پیش دستی

یارب مرے خامے کو زباں دے
منقار ہزار داستاں دے
افسانہ گل بکاؤلی کا
افسوں ہو بہار عاشقی کا
ہر چند سنا گیا ہے اس کو
اردو کی زباں میں سخن گو
وہ نثر ہے داد نظم دوں میں
اس مے کو دو آتشہ کروں میں

ہر چند اگلے جو اہل فن تھے
سلطان قلمرو سخن تھے

آگے ان کے فروغ پانا
سورج کو چراغ ہے دکھانا

پر بحر سخن سدا ہے باقی
دریا نہیں کار بند ساقی

طعنے سے زباں نکتہ چیں روک
رکھ ہے میری اہل خامہ میں نوک

خوبی سے کرے دلوں کو تخیر
نیرنگ نسیم باغ کشمیر

نقطے ہوں سفید خوش بیانی
جدول ہو حصار سحر خوانی

جو نکتہ لکھوں کہیں نہ حرف آئے
مرکز پہ کشش مری کھینچ جائے

ان کا جو الم چمن چمن ہے
یوں بلبل خامہ نعرہ زن ہے

گل چیں نے وہ پھول جب اڑایا
اور غنچہ صبح کھلکھلایا

وہ سبزۂ باغ خواب آرام
یعنی وہ بکاؤلی گل اندام

جاگی مرغ سحر کے غل سے
اٹھی نکہت سی فرش گل سے
منہ دھونے جو آنکھ ملتی آئی
پر آب وہ چشم حوض پائی
دیکھا تو گل ہوا ہوا ہے
کچھ اور ہی گل کھلا ہوا ہے
گھبرائی کہ ہیں کدھر گیا گل
جنجھلائی کہ کون دے گیا جل
ہے ہے مرا پھول لے گیا کون
ہے ہے مجھے خار دے گیا کون
ہاتھ اس پہ اگر پڑا نہیں ہے
بو ہو کے تو پھول اڑا نہیں ہے
نرگس تو دکھا کدھر گیا گل
سوسن تو بتا کدھر گیا گل
سنبل مرا تازیانہ لانا
شمشاد انہیں سولی پر چڑھانا
تھرائیں خواصیں صورت بید
ایک ایک سے پوچھنے لگی بھید
نرگس نے نگاہ بازیاں کیں
سوسن نے زباں درازیاں کیں
پتا بھی پتے کو جب نہ پایا
کہنے لگی کیا ہوا خدایا

اپنوں میں سے پھول لے گیا کون
بیگانہ تھا سبزی کے سوا کون
شبنم کے سوا چرانے والا
اوپر کا تھا کون آنے والا
جس کف میں وہ گل ہو داغ ہوجائے
جس گھر میں ہو گل چراغ ہوجائے
بولی وہ بکاؤلی کہ افسوس
غفلت سے یہ پھول پر پڑی اوس
آنکھوں سے عزیز گل مرا تھا
پتلی وہی چشم حوض کا تھا
نام اس کا صبا نہ لیتی تھی میں
اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں
نام اس کا صبا نہ لیتی تھی میں
اس گل کو ہوا نہ دیتی تھی میں
گل چیں کا جو ہائے ہاتھ ٹوٹا
غنچے کے بھی منہ سے کچھ نہ پھوٹا
او خار پڑا نہ تیرا جنگل
مشکیں کس لیں نہ گرتے سنبل
او باد صبا ہوا نہ بتلا
خوشبو ہی سنگھا تپا نہ بتلا
بلبل تو چہک اگر خبر ہے
گل تو ہی مہک بتا کدھر ہے

لرزاں تھی زمیں یہ دیکھ کہرام
تھی سبزی سے راست مو بر اندام
انگلی لب جو پہ رکھ کے شمشاد
تھا دم بخود اس کی سن کے فریاد
جو نخل تھا سوچ میں کھڑا تھا
جو برگ تھا ہاتھ مل رہا تھا
رنگ اس کا غرض لگا بدلنے
گل برگ سے کف لگی وہ ملنے

اک مرغ ہوا اسیر صیاد
دانا تھا وہ طائر چمن زاد
بولا جب اس نے باندھے بازو
کھلتا نہیں کس طمع پہ ہے تو
بیچا تو ٹکے کا جانور ہوں
گر ذبح کیا تو مشت پر ہوں
کھولا تو مفارقت ہے انجام
دانا ہو تو مجھ سے لے مرے دام
بازو میں نہ تو میرے گرہ باندھ
سمجھاؤں جو پند اسے گرہ باندھ
سن کوئی ہزار کچھ سنائے
کیجیے وہی جو سمجھ میں آئے

قابو ہو تو کیجیے نہ غفلت
عاجز ہو تو ہاریے نہ ہمت
آتا ہو تو ہاتھ سے نہ دیجیے
جاتا ہو تو اس کا غم نہ کیجئے
طایر کے یہ سن کلام صیاد
بن داسوں ہوا غلام صیاد
بازو کے جو بند کھول ڈالے
طائر نے تڑپ کے پر نکالے
اک شاخ پہ جا چہک کے بولا
کیوں پر مرا کیا سمجھ کے کھولا
ہمت نے مری مجھے اڑایا
غفلت نے تری مجھے چھڑایا
دولت نہ نصیب میں تھی تیرے
تھا لعل نہاں شکم میں میرے
دے کر صیاد نے دلاسا
چاہا پھر کچھ لگائے لاسا
بولا وہ کہ دیکھ کر گیا جعل
طائر بھی کہیں نگلتے ہیں لعل
ارباب غرض کی بات سن کر
کر لیجیے یک بیک نہ باور

کرتی تھی جو بھوک پیاس بس میں
آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں

جامے سے جو زندگی کے تھی تنگ
کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ

یک چند جو گذرے بے خور و خواب
زائل ھوئی اس کی طاقت و تاب

صورت میں خیال رہ گئی وہ
ھیئت میں مثال رہ گئی وہ

آنے لگے بیٹھے بیٹھے چکر
فانوس خیال بن گیا گھر

پریاں جو اس کی پاسباں تھیں
دانا و عقیل و خوش بیاں تھیں

سمجھانے لگیں کہ مرتی ھے کیوں
ترک خور و خواب کرتی ھے کیوں

ثابت نہ کچھ اثر ستارے کا ھے
اس چاند کو کیا گہن لگا ھے

رحم اپنی جوانی پر ذرا کر
منہ دیکھ تو آئینہ لگا کر

صورت تیری زار ہو گئی ھے
گل ہو کے تو خار ہو گئی ھے

ھے ھے تیری عقل کس نے کھوئی
ناجنس کو چاھتا ھے کوئی

سہتی نہیں آگ ماھی تر
رھتا نہیں پانی میں سمندر

مذکور نہیں ھے کچھ حسد کا
ساتھی نہیں کوئی کار بد کا

روشن ھے جو کچھ کیا ھے اندھیر
پھر اپنی سمجھ سمجھ کا ھے پھیر

محبوس کیا ھے تجھ کو ھر چند
توبہ کا تو در نہیں کیا بند

بھولے سے بھی کر نہ یاد آدم
پھر گھر وھی، تو وھی، وھی ھم

اے شمع نہ سوچی گر بد و نیک
رشتہ کاٹے گا تجھ سے ھر ایک

سمجھانے سے تھا ھمیں سر و کار
اب مان نہ مان تو ھے مختار

تو قید جفا میں ھے کہ ھم ھیں
تو دام بلا میں ھے کہ ھم ھیں

غم راہ نہیں کہ ساتھ دیجے
دکھ بوجھ نہیں کہ بانٹ لیجے

جھنجھلائی بکاؤلی کہ بس بس
اب ایک کھوگے تم تو میں دس

رنجور جو ھوں تو میں تمہیں کیا
مجبور جو ھوں تو میں تمہیں کیا

مانا مری حالت اب ردی ہے
بہتر ہے وہی جو کچھ بدی ہے

بلبل اسی رشکِ گل کی ہوں میں
تم کیا ہو ہزار میں کہوں میں

سوچیں وہ کہ یہ نہیں سمجھتی
ہے بلکہ برنگ زلف الجھتی

مجنوں ہو اگر تو فصد لیجیے
سایہ ہو تو دوڑ دھوپ کیجیے

کچھ روگ جو در پئے خلش ہو
داماں کے لیے دوا دوش ہو

بیماری عشق لادوا ہے
اس باغ کی اور ہی ہوا ہے

آخر یہ تو جی سے اپنے ہے تنگ
ایسا نہ ہو لائے اور کچھ رنگ

یاد آئیں جو ابروانِ خمدار
ریتے نہ کہیں گلے پہ تلوار

وہ سبزۂ خط جو یاد آئے
جھنجھلا کے کہیں نہ زہر کھائے

کر یاد کہیں چۂ ذقن کو
کودے نہ کنویں میں باؤلی ہو

دیوانے کی مطلق العنانی
ہے باعثِ مرگِ ناگہانی

تدبیر کا حوصلہ نکالا
زبخیر کا سلسلہ نکالا

بیڑی تھی رخ جنوں کی کاکل
پابوسیٔ گل کو آیا سنبل

جب وحشتِ عشق ہو زیادہ
زنجیر ہے پیش پافتادہ

شوریدہ بکاؤلی غضب تھی
زنجیروں میں بھی وہ بند کب تھی

بڑھتی جب دل کی بیقراری
پڑھتی یہ غزل بآہ و زاری

عالم کا تیرے جہاں بیاں ہے
بیتابیٔ دل جہاں جہاں ہے

زنجیر جنوں کڑی نہ پڑیو
دیوانے کا پاؤں درمیاں ہے

ذرے کا بھی چمکے گا ستارہ
قائم جو زمین و آسماں ہے

جو داغ کہ مہر ہے فلک پر
دل میں مرے اب تلک نہاں ہے

کس سوچ میں ہو نسیم بولو
آنکھیں تو ملاؤ دل کہاں ہے

(۵)

اندر اس امرنگر ہے شہر ایک
خلقت ہے وہاں کی زندہ دل نیک

اندر ہے بادشاہ اس کا
آسن ہے تخت گاہ اس کا

مفتوں وہ قضا سے اس قدر ہے
اس بستی کا نام امرنگر ہے

یزدانیوں کا ہے مسکن اس میں
روحانیوں کا نشیمن اس میں

کہتے ہیں مؤرخان ہندی
آباد ہوا پہ ہے یہ بستی

راجہ کہ کمال پارسا ہے
مقبول جناب کبریا ہے

خالق نے دیا ہے فوق اس کو
نغمے سے ہے ذوق شوق اس کو

انسان کا سرور رقص کیا ہے
پریوں کا ناچ دیکھتا ہے

باری باری سے جو پری ہے
راجہ اندر کی مجرئی ہے

لیکن جو بکاؤلی دل افگار
باری پہ پہنچ سکی نہ بیمار

اک شب راجا تھا محفل آرا
یاد آئی بکاؤلی دل آرا

پوچھا پریوں سے کچھ خبر ہے
شہزادی بکاولی کدھر ہے

منہ پھیر کے ایک مسکرائی
آنکھ ایک نے ایک کو دکھائی

چتون کو ملا کے رہ گئی ایک
ہونٹوں کو ہلا کے رہ گئی ایک

بولا وہ کہ چپ ہو کیا سبب ہے
بولیں وہ کہ کہیے بے ادب ہے

ناتا پریوں سے اس نے توڑا
رشتہ اک آدمی سے جوڑا

وہ سن کے خفا ہوا کہ جاؤ
جس طرح سے بیٹھی ہو اٹھا لاؤ

پریاں اڑیں اوپر اوپر آئیں
مہتابی پہ مثل ابر چھائیں

دیکھا تو وہ دونو کرتے تھے خواب
گل تکیے تھے آفتاب و مہتاب

غافل جو مؤکلوں نے پایا
اس نقش مراد کو جگایا

جاگی تو سب اس کے جوڑ کی تھیں
اندر کے اکھاڑے کی پری تھیں

بولیں کہ طلب کیا ہے چلیے
جوڑا یہ خراب ہے بدلیے

اٹھی اسے جی کی طرح چھوڑا
بدلا مانند رنگ جوڑا

ساتھ ان کے وہ تابہ محفل آئی
لرزاں لرزاں مقابل آئی

راجہ نے نگاہ کی غضب سے
پوچھا کہ یہ بے حیائی کب سے

بو آتی ہے آدمی کی لے جاؤ
ناپاک ہے آگ اسے دکھا لاؤ

شعلہ سا پری کا جسم کانپا
منہ دامن اشک تر سے ڈھانپا

پریوں نے کشاں کشاں نکالا
صندل آتش کدے میں ڈالا

کافور سے جل اٹھی سراپا
ٹھنڈی ہوئیں تھا جنھیں جلاپا

جو آتش گل نہ لے چمن سے
جھونکا اسے آگ میں جلن سے

جس رخ پہ تھی کاکل معنبر
تھا چشم زدن میں دود اخگر

جس جسم پہ تھی نفیس پوشاک
شعلے کے سوا نہ کچھ تھا خاشاک

عیسیٰ نفس ایک خضر آئی
چھینٹے سے جلی ہوئی جلائی

شعلہ سے زیادہ پاک داماں
آ کر ہوئی انجمن میں رقصاں

ناچی گائی غریب ناچار
اغیار ادا سے کر لیے یار

برخاست کا وقت صبح دم تھا
راجا کہ وہ صاحب کرم تھا

بولا جا یوں ہی آئیو روز
جل بجھ کے سدا سنائیو روز

رخصت پاتے ہی وہ ہوائی
پراں پراں ہوا سے آئی

محفل میں جو آئی شمع محفل
پروانوں کا ہاتھ سے گیا دل

جو گاتی تھیں بیٹھیں مثل آواز
مجرے کو اٹھی وہ صورت ناز

وہ ناچنے کیا کھڑی ہوئی تھی
خود راگنی آ کھڑی ہوئی تھی

مثنوی

نواب مرزا شوق دہلوی

لکھ قلم پہلے حمد رب ودود
کہ ہر اک جا پہ ہے وہی موجود

ذات معبود جاودانی ہے
باقی جو کچھ کہ ہے وہ فانی ہے

ہمسر اس کا نہیں ندیم نہیں
سب ہیں حادث کوئی قدیم نہیں

مدح احمد زباں پہ کیونکر آئے
بحر کوزہ میں کس طرح سے سمائے

ذات احمد کو کوئی کیا جانے
یا علی جانے یا خدا جانے

ہے بنا جب سے گلشن ایجاد
ہوئی ہر شے ہر ایک کو امداد

رنگ خوبی عطا کیا گل کو
نالہ و درد بخشا بلبل کو

ماہ کو نور لطف ہالہ کو
چشم نرگس کو داغ لالہ کو

راستی کی عطا صنوبر کو
پیچ سنبل کو آب گوہر کو

سختی ساری بتوں کے دل میں دی
الفت انساں کے آب و گل میں دی

عشق سے کون ہے بشر خالی
کردیے جس نے گھر کے گھر خالی

پڑتے ہیں اس میں جان کے لالے
ڈالتا ہے جگر میں تبخالے

جو کہ واقف تھے سب قرینوں سے
خاک چھنوائی ان حسینوں سے

اس سے امید رکھنا ہے بے‌جا
بھائی مجنوں سے کیا سلوک کیا

منہ سے کرنے نہ دی فغاں اس نے
مارے چن چن کے نوجواں اس نے

اس سے جس نے ذرا تپاک کیا
سب سے پہلے اسے ہلاک کیا

آتش ہجر سے جلاتا ہے
آگ پانی میں یہ لگاتا ہے

مار ڈالا تماش بینوں کو
زہر کھلوا دیا حسینوں کو

بس میں ڈالے نہ کبریا اس کے
رحم دل میں نہیں ذرا اس کے

جاے عبرت سراے فانی ہے
مورد مرگ ناگہانی ہے

اونچے اونچے مکان تھے جن کے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے

جس چمن میں تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اس جا ہے آشیانہ بوم

بات کل کی ہے نوجواں تھے جو
صاحب نوبت و نشاں تھے جو

آج خود ہیں نہ ہے مکاں باقی
نام کو بھی نہیں نشاں باقی

غیرت حور مہ جبیں نہ رہے
ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے

جو کہ تھے بادشاہ ہفت اقلیم
ہوے جا جا کے زیر خاک مقیم
کوئی لیتا نہیں اب اس کا نام
کون سی گور میں گیا بہرام
اب نہ رستم نہ سام باقی ہے
اک فقط نام ہی نام باقی ہے
کل جو رکھتے تھے اپنے فرق پہ تاج
آج ہیں فاتحہ کو وہ محتاج
تھے جو خودسر جہاں میں مشہور
خاک میں مل گیا سب ان کا غرور
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
گردش چرخ سے ہلاک ہوے
استخواں تک بھی ان کے خاک ہوے
تھے جو مشہور قیصر و فغفور
باقی ان کا نہیں نشاں قبور
تاج میں جنکے ٹکتے تھے گوہر
ٹھوکریں کھاتے ہیں وہ کاسہ سر
رشک یوسف جو تھے جہانمیں حسیں
کھا گئے ان کو آسماں و زمیں

هر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے

ہے نہ شیریں نہ کوھکن کا پتا
نہ کسی جا ہے نل دمن کا پتا

بوے الفت تمام پھیلی ہے
باقی اب قیس ہے نہ لیلیٰ ہے

صبح کو طائران خوش الحاں
پڑھتے ہیں کل من علیھا فان

موت سے کس کو رستگاری ہے
آج وہ کل ہماری باری ہے

آگے آگے ہے کچھ جلوس رواں
سر کھلے پیچھے کچھ ہیں پیر و جواں

سن رسیدہ ہیں عورتیں کچھ سات
سینہ و سر پہ مارتی ہیں ہات

کوئی ماما ہے کوئی دائی ہے
کوئی انا کوئی کھلائی ہے

جب وہ بھرتی ہیں غم سے آہ سرد
سننے والوں کے دلمیں ہوتا ہے درد

ہوتا غیروں کو ہے ملال ان کا
دیکھا جاتا نہیں ہے حال ان کا

کچھ بیاں ایسے ہوتے جاتے ہیں
راستے والے روتے جاتے ہیں

اس کے پیچھے پڑی پھر اس پہ نگاہ
کہ نہ دیکھے بشر معاذاللہ

شامیانہ نیا ذری کا ہے
نیچے تابوت اس پری کا ہے

سہرا اس پر بندھا ہے اک زر تار
جیسے گلشن کی آخری ہو بہار

تھی پڑی اس پہ ایک چادر گل
جس سے خوشبو نکلتی تھی بالکل

عود سوز آگے آگے روشن تھے
مر گئے پر بھی لاکھ جوبن تھے

بھیڑ تابوت کے تھی ایسی سات
جیسے آئے کسی دلہن کی برات

سب وضیع و شریف تھے ہمراہ
بھیڑ تھی اس قدر کہ تنگ تھی راہ

ساتھ تھے خویش و اقربا سارے
رو رہے تھے غریب بیچارے

پیچھے پیچھے تھا سب کے سوداگر
مو پریشاں، اداس، خاک بسر

آگے آگے جنازہ جاتا تھا
غش اسے ہر قدم پہ آتا تھا

ہاتھ تھامے تھے اقربا سارے
تا کسی جا پہ سر نہ دے مارے

حال اس درجہ ہو رہا تھا زبوں
بہتا جاتا تھا سر کے زخم سے خوں

سب امیر و فقیر روتے تھے
دیکھ کر راہ گیر روتے تھے

پیچھے سب کے فنس میں تھی مادر
کہتی جاتی تھی اس طرح رو کر

تیری میت پہ ہو گئی میں نثار
کم سخن ہائے میری غیرت دار

دل پہ جو گزری کچھ بیاں نہ کی
کچھ وصیت بھی میری جان نہ کی

کچھ نہیں ماں کی اب خبر تم کو
کس کی یہ کھا گئی نظر تم کو

دل ضعیفی میں میرا توڑ گئیں
بیٹا اس ماں کو کس پہ چھوڑ گئیں

تازہ پیدا جگر پہ داغ ہوا
گھر مرا آج بے چراغ ہوا

دل کو ہاتھوں سے کوئی ملتا ہے
جی سنبھالے نہیں سنبھلتا ہے

زہر دے دے کوئی، میں کھا جاؤں
یا زمیں شق ہو، میں سما جاؤں

داغ تیرا جگر جلاتا ہے
چاند سا مکھڑا یاد آتا ہے

مٹ گیا لطف زندگانی کا
دل کو غم ہے تری جوانی کا

بیاہ تیرا رچانے پائی نہ میں
کوئی منّت بڑھانے پائی نہ میں

تیری صورت کے ہوگئی قرباں
چلیں دنیا سے کیسی پر ارماں

ہوئیں کس بات پر خفا بولو
اماں واری ذرا جواب تو دو

بولتیں تم نہیں پکارے سے
اب جیوں گی میں کس سہارے سے

کیا قضا نے جگر پہ داغ دیا
آج گھر میرا بے چراغ کیا

نکلا ماں باپ کا نہ کچھ ارماں
ہائے بیٹی نہ تم چڑھیں پرواں

ایسی اس ماں سے ہوگئیں بیزار
کی نہ خدمت بھی پڑ کے کچھ بیمار
نہ جیوں گی ترے فراق میں میں
دل تڑپتا ہے آنکھیں ڈھونڈتی ہیں
کس مصیبت میں پڑ گئی بیٹا
کوکھ میری اجڑ گئی بیٹا

قصائد

سودا

اٹھ گیا بہمن و دے کا چمنستان سے عمل
تیغ اردی نے کیا ملک خزاں مستأصل

سجدۂ شکر میں ہے شاخ ثمر دار ہر ایک
دیکھکر باغ جہاں میں کرم عز و جل

قوت نامیہ لیتی ہے نباتات کا عرض
ڈال سے پات تلک، پھول سے لیکر تا پھل

واسطے خلعت نوروز کے ہر باغ کے بیچ
آپ جو قطع لگی کرنے روش پر مخمل

بخشتی ہے گل نورستہ کی رنگ آمیزی
پوشش چھیٹ قلمکار بہر دشت و جبل

عکس گلبن یہ زمیں پر ہے کہ جس کی آگے
کار نقاشی مانی ہے دوم وہ اول

تار بارش میں پروتے ہیں گہر ہائے تگرگ
ہار پہنانے کو اشجار کے ہر سو بادل

بار سے آب رواں عکس ہجوم گل کے
لوٹے ہے سبزہ پہ از بسکہ ہوا ہے بےکل

شاخ میں گل کی نزاکت یہ بہم پہنچی ہے
شمع ساں گرمئی نظارہ سے جاتی ہے پگھل

جوش روئیدگی خاک سے کچھ دور نہیں
شاخ میں گاؤ زمیں کے ہے جو پھوٹے کونپل

دم عیسیٰ سے فزوں فیض ہوا ہے یاں تک
دین میں قسم جمادات سے شاید ہو خلل

فکر رہتی ہے مجھے یہ کہ زباں سے اپنے
کہیں دعوائے خدائی نہ کریں لات و ہبل

حد ایام کی پیش از مدد نامیہ سے
بچہ مرغ چمن تخم سے آتا ہے نکل

سبز ہوتا ہے فصیحی کے سبب سے ہر بار
جو زباں سے سخن اب طوطی کے آتا ہے نکل

دست گل خوردہ و شاخ گل و گلزار بہم
بجہاں نشو و نما کرنے میں ہیں ضرب مثل

غنچہ پہ کچھ نہیں موقوف عجب فصل ہے یہ
گل بہم پہنچے ہے عقدہ ہو کسی طرح کا حل

آوے ہے ان کے نظر لاکھ طرح کا وہ پھول
اون گلوں چھٹ جو نگہ کے ہیں سدا مستعمل

یا سمن رنگ جو رکھتی ہے خزاں سے مانا
چاہتی ہے بسماجت کرے سبزے سے بدل

چشم نرگس کی بصارت کی زبس ہے درپے
غنچہ لالہ نے سرمہ سے بھری ہے نکحل

اس قدر محو تماشا ہے کہ نرگس کی طرح
چشم سیار گلستاں میں جھپکتی نہیں پل

آبجو گرد چمن لمحہ خورشید سے ہے
خط گلزار کے صفحہ پہ طلائی جدول

سایۂ برگ ہے اس لطف سے ہر اک گل پر
ساغر لعل میں جوں کیجئے زمرد کو حل

سنگ نے رتبہ آئینہ کیا ہے پیدا
تیغ کہسار ہوئی بسکہ ہوا سے صیقل

برگ برگ چمن ایسی ہی صفا رکھتا ہے
گل کو دیکھو تو نگہ جا رہے سنبل پہ پھسل

لڑکھڑاتی ہوئی پھرتی ہے خیاباں میں نسیم
پاؤں رکھتی ہے صبا صحن میں گلشن کے سنبھل

اتنی ہے کثرت لغزش بزمیں ہر باغ
جو ثمر شاخ سے اترا سو گرا سر کے بل

فیض تاثیر ہوا یہ ہے کہ اب حنظل سے
شہد ٹپکے جو لگے نشتر زنبور عسل

دانہ جس شور زمیں سے نہ پھلا دھقاں سے
سبز واں دانہ شبنم سے ہوا ہے جنگل

کشت کرتے ہیں ہر اک تخم سے ازفیض ہوا
گرتے گرتے بزمیں برگ و بر آتا ہے نکل

سبز فام ان دنوں آتا ہے نظر ہر گلرو
خواہ ہو شیخ پسر خواہ ہو فرزند مغل

جوہری کو چمنستان جہاں میں اس فصل
آگیا لعل و زمرد کے پرکھنے میں خلل

تا کجا شرح کروں میں کہ بقول **عرفی**
اخگر از فیض ہوا سبز شود در منقل

نسبت اس فصل کو پر کیا ہے سخن سے میرے
ہے فضا اس کے تو دو چار ہی دن میں فیصل

اور میرا سخن آفاق میں تا یوم قیام
رہے گا سبز بہر مجمع و ہر یک دنگل

تا ابد طرز سخن کی ہے مری رنگینی
جلوۂ رنگ چمن جاوے گا اک آن میں ڈھل

نام تلخی نہیں مجھ نطق میں جز شیرینی
یک طرف نار گلستاں میں ہے یکسو حنظل

ہیں برومند سخنور مرے ہر مصرعہ سے
مصرعہ سرو سے پایا ہے کسی نے بھی پھل

ہو جہاں کے شعرا کا مرے آگے سر سبز
نہ قصیدہ نہ مخمس نہ رباعی نہ غزل

ہے مجھے فیض سخن اس کے ہی مداحی کا
ذات پر جس کے مبرھن کنہ عز و جل

مہر سے جس کے منور رہے دل جوں خورشید
رو سیہ کینے سے جس کے رہے مانند زحل

بغض جس کا کرے جوں مور سلیماں کو ضعیف
مور کو حب سے ملے جسکے یلوں کا سا بل

شیر یزداں شہ مرداں علی عالی قدر
وصی ختم رسلؐ اور امام اول

خاک نعلین کی جس کی مدد طالع سے
پہنچے اس شخص کو جو شخص ہو اعمائے ازل

وہ نظر آئے اسے دھر کی بینائی سے
رہ گیا اور رہے گا جو ابد تک اوجھل

مدح غائب سے کھلے اسکے نہ مداح کا دل
رو برو مطلع ثانی سے یہ ہو عقدہ حل

دید تیرا بدوئی حق سے نگہ کا ہے خلل
ایک شے دو نظر آتی ہے بچشم احول

تیری قدرت بجہاں قدرت حق کے خاطر
خلق کے وہم غلط کار میں ٹھرے ہے شل

مرضی حق تری مرضی سے ہے جوں جوھر فرد
اس یقیں میں نہ گماں کر سکے زنہار خلل

علم تیرا نہیں کچھ علم خدا سے باہر
ہے عمل بھی وہی تیرا جو خدا کا ہے عمل

راے تیری کے موافق جو نہ لکھے نسخہ
کرے تاثیر نہ عیسیٰ کا مداوا بہ کسل

سر کے پیکان نہ قبضہ سے کماں کے سر ہو
ہو اشارہ جو ترا تیر قضا کو آنچل

ٹک تری مرضی سے باہر جو کرے کام جہاں
ہاتھ سے کام زمانے کے دوہیں جاے بچل

سایہ میں دست کرم کے ترے ہر صبح و مسا
دولت ہر دو جہاں سے ہو غنی عبد اقل

دین و دنیا کی ہے اشیا سے کہیں وہ اعلیٰ
ہووے جو شے تری اشیا میں سبھوں سے اسفل

جو گدا ہے بجہاں تیرے گدا کے در کا
اسکی درگاہ و گدا کہیے جسے اہل دول

ایسی بخشش نہوئی تجھ سے کہ جسکی بشمار
حد تعداد ہے جتنی نہوئی ہو فیصل

وصف تجھ تیغ دوسر کا میں کروں کیا شہ دیں
دل مجنوں کی جو میدان میں کرے ہے صیقل

اس کے قبضہ پہ جو ہو دست مبارک تیرا
نہ رہیں دین محمدؐ کے سوا اور ملل

کھینچ اسے گر تو عدو پر کرے میداں میں نہیب
استقامت کا زمانہ کے قدم جاے نکل

عرض میں سے دو طرف ہو کے لگے بہنے طول
پڑے دریا میں جو وہ تفرقہ انداز اوگل

قصیدہ گھوڑے کی ہجو میں

ہے چرخ جب سے ابلق ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دست عناں کا بیک قرار

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانے کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو گھٹاتے ہیں وہ ادھار

تنہا وے نہ دھر سے عالم خراب ہے
خست نے اکثروں سے اٹھایا ہے ننگ و عار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں
پاوے سزا جو ان کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپے کے دنائت کی راہ سے
گھوڑا رکھیں ہیں ایک سو اتنا ذلیل و خوار

نے دانہ و نہ کاہ نہ تیمار نہ سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار

ناطاقتی میں اسکی کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اسکے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس مرتبہ کو بھوک سے پونہچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اسکا جو بازار میں گذار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کروگے یاد
امیدوار ہم بھی ہیں کہتے ہیں یوں چمار

جس دن سے اس قصائی کے کھونٹے بندھا ہے وہ
گذرے ہے اس نمط اسے ہر لیل و ہر نہار

ہر رات اختروں کے تئیں دانہ بوجھ کر
دیکھے ہے آسماں کئی طرف ہو کے بیقرار

خط شعاع کو وہ سمجھ دستہ گیاہ
ہر دم زمیں پہ آپکو پٹکے ہے بار بار

تنکا اگر کہیں پڑا دیکھے ہے گھاس کا
چوگے کو آنکھیں موند کے دیتا ہے منہ پسار

دیکھے ہے جب وہ توبڑہ و تھان کی طرف
کھودے ہے اپنے سم سے کُنویں ٹاپیں مار مار

ہے اسقدر ضعیف کہ اڑ جاے باد سے
میخیں گر اسکے تھان کی هوویں نہ استوار

نہ استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں
دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لوہار
سمجھا نہ جاوے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ
خارشت سے ز بسکہ ہے مجروح بیشمار
ہر زخم پر ز بسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں
کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار
یہ حال اس کا دیکھ غرض یوں کہے ہے خلق
چنگل سے موذی کے تو چھڑا اسکو کردگار
القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور
آیا یہ دل میں جائیے گھوڑے پہ ہو سوار
رہتے تھے گھر کے پاس قضا را وہ آشنا
مشہور تھا جنہوں کنے وہ اسپ نابکار
خدمت میں میں نے انکی کیا جاکے التماس
گھوڑا مجھے سواری کو اپنا دو مستعار
فرمایا تب انہوں نے کہ اے مہربان من
ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار
لیکن کسو کے چڑھنے لائق نہیں یہ اسپ
یہ واقعی ہے اسکو نہ جانو گے انکسار
صورت کا جس کی دیکھنا ہے گورخر کو ننگ
سیرت سے جس کی نت ہے سگ خشتگی کو عار

بدرنگ جیسے لید ہے بدبو ہے جوں پشاب
بدیمن یہ کہ اصطبل اوجڑ کرے ہزار
مانند مینچو کی لکدزن ہے تھان پر
لا جنب وہ زمیں سے ہے جوں میخ استوار
حشری ہے اس قدر کہ بہ حشر اس کی پشت پر
دجال اپنے منھ کو سیہ کر کے ہو سوار
اتنا وہ سرنگوں ہے کہ سب اڑ گئے ہیں دانت
جبڑے پہ بسکہ ٹھوکروں کی نت پڑے ہے مار
ہے پیر اس قدر کہ بتلاوے اسکا سن
اول وہ لیکھے ریگ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے ز روے تواریخ یاد ہے
شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار
کمزور اس قدر ہے کہ گر اسکی نعل کا
لوہا گلا کے تیغ بناوے کوئی لوہار
ہے مجھ کو یہ یقین کہ وہ تیغ روز جنگ
رستم کے ہاتھ سے نہ چلے وقت کارزار
مانند اسپ خانہ شطرنج اپنے پاؤں
جز دست غیر کے نہیں چلتا ہے زینہار
اک دن گیا تھا مانگے یہ گھوڑا برات میں
دولا جو بیاہنے کو چلا اسپہ ہو سوار

سبزے سے خط سیاہ و سیہ سے ہوا سے سفید
تھا سرو سا جو قد سو ہوا شاخ باردار

پونہچا غرض عروس کے گھر تک وہ نوجواں
شیخوخیت کے درجے سے کر اس طرف گذار

مٹھا تو اس قدر ہے وہ جو کچھ کہ تم سنا
لیکن اک اور دن کی حقیقت کہوں میں یار

دھلی تک آن پہنچا تھا جس دن کہ مرھٹا
مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقت کار

مدت سے کوڑیوں کو اڑایا ہے گھر میں بیٹھ
ہوکر سوار اب کروں میدان کارزار

ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اسپہ زیں
ہتھیار باندھ کرکے ہوا اس پہ پھر سوار

جس شکل سے سوار تھا اس روز اس پہ میں
دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار

چابک تھی دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منھ میں باگ
تکتک سے پاشنے کی میرے پاؤں تھے فگار

آگے سے توبڑا اسے دکھلاے تھا سئیس
پیچھے نقیب ھانکے تھا لاٹھی سے مار مار

ھرگز وہ اس طرح بھی نہ لاتا تھا رو براہ
ہلتا نہ تھا زمین سے مانند کوھسار

اس مضحکہ کو دیکھ ہوے جمع خاص و عام
اکثر مدبروں میں سے کہتے تھے یوں پکار

پہیے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں
یا بادبان باندھ پون کے دو اختیار

میں آگیے کیا کہوں کہ ہر اک اس کی شکل دیکھ
تیغِ زباں سے کاٹ کے کرتا تھا گل نثار

کہتا تھا کوئی ہے بز کوہی نہیں یہ اسپ
کہتا تھا کوئی ہوگا ولایت کا یہ حمار

کہتا تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ
کتوال نے گدھے پہ تجھے کیوں کیا سوار

کہنے لگا پھر آ اسی مجمع میں ایک شخص
مرکب نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہ گار

سمجھوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں
ڈائن چلی ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار

اس مخمصے میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک اور
فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے آ دوچار

دھوبی، کمہار کے گدھے اس دن ہوے تھے گم
اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے وہاں گذار

ہر اک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر
پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمہار

دریاے کشمکش ہوا اس آن موج زن
تھا عنقریب ڈوبئے خفت سے ایک بار
بدپشمی اس کی دیکھ کے کر خرس کا خیال
لڑکے بھی وہاں تھے جمع تماشے کو بے شمار
رکھتا تھا آ کے کوئی سپاری کو منہ کے بیچ
مو اس کے تن سے کوئی اکھاڑے تھا بار بار
کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اس کے گرد و پیش
ساتھ اس سمند خرس نما کے ہو چشم چار
کہتا تھا کوئی مجھ سے کہ مجھ کو بھی لے چڑھا
دونگا ٹکا تجھے تو میں نو چندہ ایتوار
اس وقت میں نے اپنے نصیبوں پہ کر نظر
کہنے لگا خدا سے یہ رو رو کے زار زار
جھگڑوں میں دھوبیوں سے کہ لڑکوں کو دوں جواب
کتوں سے یا لڑوں کہ مروں اپنا پیٹ مار
بارے دعا ہوئی میری اس وقت مستجاب
وہاں سے بہر نمط کیا جنگاہ تک گذار
دست دعا اٹھا کے میں پھر وقتِ روزِ جنگ
کہنے لگا جناب الٰہی میں یوں پکار
پہلے ہی گولی چھوٹتے اس گھوڑے کو لگے
ایسا لگے نہ تیر کہ ہووے نہ تن سے پار

یہ کہہ کے میں خدا سے ہوا مستعدِ جنگ
اتنے میں مرہٹا بھی ہوا مجھ سے آ دوچار

گھوڑا تھا بسکہ لاغر و پست و ضعیف و خشک
کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار

جاتا تھا میں ڈپٹ کے جب اس کو حریف پر
دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جوں طفلِ نے سوار

جب دیکھا میں کہ جنگ کی یوں یاں بندھی ہے شکل
لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا بغل میں مار

دھر دھمکا واں سے لڑتا ہوا شہر کی طرف
القصہ گھر میں آن کے میں نے کیا قرار

گھوڑے میرے کی شکل یہ ہے تم نے جو سنی
اسپر بھی دل میں آوے تو اب ہو جئے سوار

سن کر تب ان سے میں نے یہ قصہ دیا جواب
اتنا بھی جھوٹ بولنا کیا ہے ضرور یار

گفتن ہمیں بس است کہ اسپ من ابلق است
سمجھوں گا اپنے دل میں اگر ہوں میں ہوشیار

سودا نے تب قصیدہ کہا سن یہ ماجرا
ہے نام اس قصیدہ کا تضحیکِ روزگار

مخمس زمانہ کی شکایت میں

کہا میں آج یہ سودا سے کیوں تو ڈاواں ڈول
پھرے ہے جا کہیں نوکر ہو لے کے گھوڑا مول
لگا وہ کہنے یہ اس کے جواب میں دو بول
جو میں کہوں گا تو سمجھے گا تو کہ ہے یہ ٹھٹھول
بتا کہ نوکری بکتی ہے ڈھیریوں یا تول

سپاہی رکھتے ہیں نوکر امیر دولتمند
سو آمد ان کی تو جاگیر سے ہوئی ہے بند
کیا ہے ملک کو مدت سے سرکشوں نے پسند
جو ایک شخص ہے بائیس صوبے کا خاوند
رہی نہ اس کے تصرف میں فوجداری کول

قوی ہیں ملک میں مفسد امیر ہیں سو ضعیف
ٹکے کہاں ہیں جو ہم دے کے ہوں انہوں سے حریف
نہ کچھ ربیع میں حاصل نہ درمیانِ خریف
جو عامل اب ہیں محالات پر سو یوں ہیں خفیف
کہ جس طرح کسی حاکم کے گھر گنوار ہو اول

بس ان کا ملک میں کارِ نسق جو یوں ہو تباہ
کہ کوۂ زر ہو زراعت میں تو نہ دیں پرِ کاہ
جگہ وہ کون سی نوکر رکھیں یہ جس پہ سپاہ
کہاں سے آویں پیادے کریں جو پیش نگہ
کدھر سوار جو پیچھے چلیں وہ باندھ کے غول

رہی فقط عربی باجے پر انہوں کی شان
جو چاہیں اس کو نہ بجواویں یہ تو کیا امکان
پر ان کو فکر ہے تخفیف خرچ کی ہر آن
رہے گا حال اگر ملک کا یہی تو ندان

گلے میں تاشہ کہاروں کے پالکی میں ڈھول

انہیں ہے اپنی امارت سے اب یہی منظور
کہ ہوں دو مورچھل اور ایک کاتبی کا سمور
نہ رسمِ صلح کی سمجھیں نہ جنگ کا دستور
جو ان میں قاعدہ‌دان تھے ہوے وہ ان سے دور

قماش ان کی طبیعت کا سب طرح سے ٹھٹھول

امیر اب جو ہیں دانا انہوں کا ہے یہ حال
ہوے ہیں خانہ نشیں دیکھ کر زمانے کی چال
بچھی ہے سوزنی خواجہ کھڑا جھاڑے ہے رمال
حضور بیٹھے ہیں اک دو ندیم اہلِ کمال

دھرا ہے سامنے اک پیکدان و اک تنبول

جو کوئی ملنے کو ان کے انہوں کے گھر آیا
ملے یہ اس سے گر اپنا دماغ خوش پایا
جو ذکرِ سلطنت اس میں وہ درمیاں لایا
انہوں نے پھیر کے اودھر سے منہ یہ فرمایا

خدا کے واسطے بھائی کچھ اور باتیں بول

جو مصلحت کے لیے جمع ہوں صغیر و کبیر
تو ملک و مال کی فکر اس طرح کریں ہیں مشیر
وطن پونہچنے کی بخشی کو سوجھے ہے تدبیر
کھڑا یہ اٹکلے دیوان خاص بیچ وزیر

کہ شامیانے کے بانسوں پہ روپئے کے ہیں خول

پڑے جو کام انہیں تب نکل کے کھائی سے
رکھیں وہ فوج جو مرتے پھرے لڑائی سے
پیادہ ہے سو ڈرے سر منڈاتے نائی سے
سوار گر پڑے سوئے میں چارپائی سے

کرے جو خواب میں گھوڑا کسی کے نیچے الول

نہ صرف خاص میں آمد نہ خالصہ جاری
سپاہی تا متصدی سبھوں کو بیکاری
اب آگے دفترِ تن کی میں کیا کہوں خواری
سوال دستخطی کو پھاڑ کرکے پنساری

کسی کو آنولے دے باندھ کر کسو کو کٹول

یہ جتنے نقدی و جاگیر کے تھے منصب دار
تلاش کرکے ڈھلیتی انہوں نے ہو ناچار
ندان قرض میں بنیوں کو دے سپر تلوار
گھروں میں اب جو نکلتے ہیں باندھ کر ہتھیار

بغل کے بیچ تو سونٹا ہے ہاتھ میں کچکول

کروں معاش کا حضرت کی تجھ سے کیا میں بیاں
کہ توشہ خانہ ہے ان کا پرائچیے کی دکان
نکل تنور کے منہ سے کبھے ہے گاؤزبان
پکی ہوں تب میں کہ جب کاتبی خلد مکان

بکی ہے تیسرے فاقے میں کوڑیوں کے مول

کبھیں جو مودی سے جا کر دواب کے حالات
جواب دے ہے کہ ہیں اونٹ تو فرشتوں کی ذات
ہوا پہ چھٹی ہے بیلوں کی اور بھس پہ برات
جو خچریں ہیں انہوں نے پیا ہے آبِ حیات

تمہارے کھانے کو دانا کہو تو دیجے تول

کئی جو گھوڑے ہیں اصطبل میں سو کیا امکان
کہ ہووے گھاس کے پٹے کا ان کے آگے نشان
کسو کی ٹوٹی ہے ٹنگڑی کسو کا چڑھ گیا کان
طویلہ اس کو کہوں یا کہ پانچ پیر کا تھان

اسی خیال میں رہتی ہے عقل ڈانواں ڈول

اور اب جو زعم میں آقا کے فیل حانا ہے
جو ہتھنی اندھی ہے اس میں تو ہاتھی کانا ہے
نہ تھوڑ چارے کا راتب کا نے ٹھکانا ہے
ہر ایک بھوکھ سے سوے عدم روانا ہے

اب اس کو خواہ تو پائل سمجھ لے خواہ نجھول

کرے ہے بھوک سے شاگرد پیشہ اب یہ معاش
کہیں پلاؤ تو باورچی وہاں پکاویں آش
کریں قناتوں میں درباں بیٹھے پردہ فاش
تلے سے کھینچ لے مسند کو آن کر فراش

اگر کہیں کہ مٹا اُٹھ کے چاندنی کا جھول

مچا رکھی ہے سلاطینوں نے یہ توبہ دھاڑ
کوئی تو گھر سے نکل آئے ہیں گریبان پھاڑ
کوئی در اپنے پہ آوے دے مارتا ہے کواڑ
کوئی کہے ہے جو ہم ایسے چھاتی کے ہیں پہاڑ

تو چاہیے کہ ہمیں سب کو زہر دیجیے گھول

غرض مآل ہے اس گفتگو سے یہ میرا
کہ بے زری نے جب ایسا گھر آن کر گھیرا
کرے تلاش معیشت کو کوئی بہتیرا
نہیں ہے فائدہ تا وہ نہ چھوڑ کر ڈیرا

کرے نہ عزم سوے اصفہانِ و استنبول

جو نوکری ہے کہیں زیرِ چرخِ نیلی فام
تو جائداد کا اس کی ہے پرگنہ سر سام
وبا کا جب سے ہے دارلخلافہ میں ہنگام
گھروں کی ضبطی کا رسم اس قدر ہوا ہے عام

ادھر کسی کا دکھا سر ادھر سے دوڑے قول

سو کیا وہ نوکری کٹتی ہو جس میں یہ اوقات
ملے ہے پیٹ کو روٹی تو رو رو آدھی رات
جو چاہو تن ڈھپے اس میں تو آگے پیچھے پات
اور اس پہ یہ ہے کہ جب ٹھہرے روز موجودات

تو پانچوں باندھیے ہتھیار اور چھٹی سستول

وہ نوکر اب جسے آقا ہر آن پہچانے
جو پوچھو اس سے کہ تم کچھ روپے لگے پانے
کہے ہے سانس کو بھر کر سوائے آٹھ آنے
روپے کی شکل تو دیکھی نہیں خدا جانے

کہ اس زمانے میں چپٹا بنے ہے یا وہ گول

غرض کہ جب تئیں ملتا ہو پاؤ بھر بھی چون
یہ نوکری وہ کرے جس کو ہووے خبط و جنون
یہ سمجھو تم کہ انہیں جب سپہ گری کے فنون
نہ آئے سیکھ تو یہ باندھنے لگے مضمون

زمانہ دیکھ کے ہتھیار ہم نے ڈالے کھول

سخن جو شہر کی ویرانی کا کروں آغاز
تو اس کو سن کے کریں ہوش چغد کے پرواز
نہیں وہ گھر نہ ہو جس میں شغال کی آواز
کوئی جو شام کو مسجد میں آئے بہرِ نماز

تو وہاں چراغ نہیں ہے بجز مراغ غول

کسی کے یہاں نہ رہا آسیا سے تا بہ اجاغ
ہزار گھر میں کہیں ایک گھر جلے ہے چراغ
سو کیا چراغ وہ گھر ہے گھروں کے غم سے داغ
اور ان مکانوں میں ہر سمت بولتے ہیں اولاغ

جہاں بہار میں سنتے تھے بیٹھ کر ہندول

خراب ہیں وہ عمارات کیا کہوں تجھ پاس
کہ جن کے دیکھے سے جاتی رہی تھی بھوک اور پیاس
اور اب یہ دیکھو تو دل زندگی سے ہوے اداس
بجاے گل چمنوں میں کمر کمر ہے گھاس

کہیں ستوں پڑا ہے کہیں پڑی مرغول

یہ باغ کھا گئی کسی کی نظر نہیں معلوم
نہ جانے کس نے رکھا یہاں قدم وہ کون تھا شوم
جہاں تھے سرو و صنوبر اب اس کی جگہ ہے زقوم
پڑی ہے زاغ و زغن سے اب اس چمن میں دھوم

گلوں کے ساتھ جہاں بلبلیں کریں تھیں کلول

جہاں آباد تو کب اس ستم کے قابل تھا
مگر کبھو کسی عاشق کا یہ نگر دل تھا
سو یوں مٹا دیا گویا کہ نقش باطل تھا
عجب طرح کا یہ بحر جہاں پہ ساحل تھا

کہ جسکی خاک سے لیتی تھی خلق موتی رول

دیا بھی وھاں نہیں روشن تھی جس جگہ فانوس
پڑے ھیں کھنڈروں میں آئینہ خانہ کے مانوس
کڑوڑ دل پر از امید ھو گئے مایوس
گھروں سے یوں نجیا کے نکل گئے ناموس
ملی نہ ڈولی انہیں تھے جو صاحب چوڈول

نجیب زادیوں کا ھے یہ ان دنوں معمول
وہ بوقعہ سر پہ ھے جسکا قدم تلک ھے طول
ھے ایک گود میں لڑکا گلاب کا سا پھول
اور ان کے حسن طلب کا ھر ایک سے یہ اصول
کہ خاک پاک کی تسبیح ھے جو لیجے مول

غرض میں کیا کہوں یارو کہ دیکھ کر یہ قہر
کڑوڑ مرتبہ خاطر میں گذرے ھے یہ لہر
جو ٹک بھی امن دل اپنے کو دیوے گردش دھر
تو بیٹھ کر کہیں یہ روئیے کہ مردمِ شہر
گھروں سے پانی کو باھر کریں جھکول جھکول

بس اب خموش ھو سودا کہ آگے تاب نہیں
وہ دل نہیں ھے کہ اس غم سے جو کباب نہیں
کسی کی چشم نہ ھوگی کہ وہ پُر آب نہیں
سوائے اس کے تری بات کا جواب نہیں
کہ یہ زمانہ ھے اک طرح کا زیادہ نہ بول

انشا

کیا چیز دیو مرد سخنداں کے سامنے
پر جلتے ہیں فرشتوں کے انساں کے سامنے

جاری مری زباں سے ہو سو زندہ رو دشہد
گویا اگر ہوں اہلِ صفاہاں کے سامنے

دلچسپ تر ہے آمد صہبا سے جام میں
میرا درود زمزمہ مستاں کے سامنے

ہے سنگ رنگ ڈھنگ یہ اپنے کلام کا
ہو جائے جھٹ جو لعل بدخشاں کے سامنے

لیلیٰ کا ہاتھ پکڑے ہوئے قیس ہو نمود
گر اڑ کھڑا ہوں خارِ مغیلاں کے سامنے

ہو جائیں مست وحش و طیور و سباع سب
ہوں کر اٹھوں جو دشت و بیاباں کے سامنے

قانونِ بوعلی سے نہیں کم کسی طرح
میرا کلام مرد شفادان کے سامنے

کیونکر نہ یہ گھمنڈ ہو بیٹھا ہوں آج میں
کیسے وزیر اعظمِ ذی‌شان کے سامنے

یعنی یمین الدولہ بہادر کہ جس کا حسن
ہو جاوے آفتاب درحشاں کے سامنے

ایسا ہے شیرِ ببر کہ جس کے جلال کا
مذکور ہووے قیصر و خاقاں کے سامنے

همت ہے اس میں ایسی کہ یہ چرخ کوزہ پشت
خم ہے اسی کے رتبۂ احساں کے سامنے

انشا تو باریاب ہوا بزم خاص سے
خم ٹھوک لے نہ رستمِ دستاں کے سامنے

بارے سپیدۂ دم صبح وطن ہوی
مدت کے بعد شامِ غریباں کے سامنے

اس وقت اک قصیدہ کوئی دھوم دھام کا
پڑھ اس وزیر حاتمِ دوراں کے سامنے

جس کے ہر ایک شعر پہ دلچسپ شوخیاں
ہیں قوت فصاحت سحباں کے سامنے

مطلع ثانی

حاضر ہوا ہوں یوسفِ کنعاں کے سامنے
یا آ گیا ہوں میں درِ تاباں کے سامنے

یاد آوے تیری چشم کی شوخی تو پھر وہیں
ساقی کرے مراقبہ فنجاں کے سامنے

آ کر حضور اقدس عالی میں ہوں کھڑے
جو لوگ بیٹھ جائیں تمرخاں کے سامنے

یوں خلق تیرے حکم میں جو خیلِ گوسفند
ہوں گلہ گلہ موسیٰ عمراں کے سامنے

کم رتبگی میں آتے ہیں اس طرح سے نظر
حسّاد تیرے نطقِ غلاماں کے سامنے

جس طرح سے مسیلمہ کے مہملات کا
هو مرتبہ بلاغتِ قرآں کے سامنے

مسرور هووے تیرے جو ذهنِ سلیم کا
آ جائے ذکر حضرتِ لقماں کے سامنے

قمری کی طرح طوق غلامی پہن هی لے
جو آوے تجھ سے سروِ خراماں کے سامنے

حب علی هے تجھکو یہاں تک کہ تیرا ذکر
جنت میں هے اباذرؓ و سلماںؓ کے سامنے

هے قوت مقررہ کا تیرے تذکرہ
مشہور فخر خطّۂ یوناں کے سامنے

شادابی اس میں ایسی کہ جوں خضرِ سبز پوش
بیٹھا هوا هو چشمۂ حیواں کے سامنے

اڑ جائیں هوش توسنِ باد بہار کے
گر دو میں هو کبھی تیرے یکراں کے سامنے

اس کی دوش کو دیکھے تو غش کھا کے لوٹ جائے
موجِ نسیم خیلِ غزالاں کے سامنے

اس کا سواد لوں شب قدر کے نمط
هووے نمود زمرۂ مستاں کے سامنے

هے مرتبہ یہ عدل کا تیرے کہ مور هو
اس عصر میں جنودِ سلیماں کے سامنے

گر برقِ تیغ کے تیری دیکھے چمک عدو
تو سمجھے یہ کہ هے دمِ ثعباں کے سامنے

تجھ کو ضمان ضامنِ ثامن مدام ہے
مقبول ہے تو شاہ خراساں کے سامنے

انشا تری دعا میں ہے مشغول رات دن
اپنے کریم و قادرِ سبحاں کے سامنے

جب تک نہو کمال درخشندگی نصیب
جرم سہا کو مہر کے لمعاں کے سامنے

آساں رہیں یہ غنچہ کی عقدہ کشائیاں
تا ناخنِ نسیمِ بہاراں کے سامنے

حاضر رہے بہار و سرور و نشاط جشن
یارب ہمیشہ تیرے گلستاں کے سامنے

افواج روم و شام و ولایت نہو سکے
ہرگز کبھی تری صف مژگاں کے سامنے

شایاں تو ہے یہی کہ تری دستِ جود کا
مذکور کیجیے موسم باراں کے سامنے

ہر چند ہوں میں بے سر و ساماں و لیک آج
آیا ہوں تجھ سے با سر و ساماں کے سامنے

کلغی مجھے بھی ہوے تعجب نہیں کہ تھا
ہدہد کے سر پہ تاج سلیماں کے سامنے

ذوق

شب کو میں اپنے سرِ بسترِ خواب راحت
نشۂ علم میں سرمست غرور و نخوت

مزے لیتا تھا پڑا علم و عمل کے اپنے
تھا تصور مرا ہر امر میں تصدیق صفت

ہو گیا علم حصولی بھی حضوری مجھ کو
تھا مرا ذہن نہ محتاجِ حصولِ صورت

جو مسائل نظری تھے وہ بدیہی تھے تمام
عقل کو تجربہ کی اتنی ہوئی تھی کثرت

نہ غرض مجھ کو نتیجہ سے نہ تھا شکل سے کام
تھی مری فکر کو ہر شکل خطا سے عصمت

ذہن میں سب مرے حاضر صُوَرِ علمیہ
پر جتانی نہ تھی منظور مجھے علمیت

چار و ناچار جو ترغیب سے یاروں کے کبھی
درس و تدریس پہ آ جاتی تھی مجھ کو رغبت

کبھی ہمت تھی مری قاعدہ صرف میں صرف
کبھی تھی نحو میں ہر نحو سے مجھے محویت

کبھی منطق کو تفوق تھا مرے ناطقہ سے
تحت حکمت ہو یہ فن گرچہ ہے تحت حکمت

کبھی میں کرتا تھا تصریح معانی و بیاں
کبھی میں کرتا تھا توضیح نجوم و ہیئت

کبھی تقسیم فرائض کبھی تفہیم اصول
کبھیَ تعلیمِ عقائد بکتابَ و سنّت

کبھی تھا علم الٰہی کی طرف ذہن رسا
کبھی کرتی تھی طبیعی میں طبیعت جودت
کبھی تھا عقل پہ مذہب مرا مانندِ حکیم
کبھی مثل متکلم مجھے پاس ملّت
کبھی کرتا تھا قدم چرخ کا ثابت بجہات
اور کبھی کرتا تھا باطل **بسماء انشقت**
کبھی انکارِ قیامت پہ میں لاتا تھا دلیل
کبھی تکرارِ تناسخ پہ مجھے سو حجّت
حشرِ اجساد میں تھا گاہ تردد مجھ کو
کبھی تھی عالمِ برزخ میں مجھے اک حیرت
کبھی تھی عرصۂ تدویرِ فلک کے مجھے سیر
کبھی میں ناپتا تھا سطحِ زمیں کی وسعت
کبھی ثابت مرے نزدیک فلک کی گردش
کبھی ثابت مرے نزدیک زمیں کی حرکت
کبھی میں کرتا تھا اغراض میں جوہر قائم
کبھی میں کرتا تھا معلول سے ثابت علّت
کبھی منقول پہ مایل، کبھی سوے معقول
کبھی میں فقہ پہ راغب کبھی سوے حکمت
کبھی میں حافظ قرآن بعلم تفسیر
کبھی میں قاری قرآن بعلم قرأت

کبھی کرتا تھا مجسطی پہ حواشی تحریر
کبھی کرتا تھا اشارات و شفا کی صحت
کبھی میں کرتا تھا قانون سے تشریح علاج
کبھی میں کرتا تھا قاموس میں تصحیح لغت
کبھی میں لون سے بینندۂ بیمار و صحیح
کبھی میں نبض سے دانندۂ ضعف و قوت
گہ نباتات کی آگاہ میں کیفیت سے
گہ جمادات کی معلوم مجھے خاصیت
کبھی مشّائیوں سے کرتا تھا میں پیشروی
کبھی لے جاتا تھا اشراقیوں پر میں سبقت
کبھی میں نفی حقائق میں تھا سوفسطائی
کبھی میں معتزلی باعث رد رویت
کبھی میں جبری و مجبور بعقل و تدبیر
کبھی میں قدری و مختار بقدر و طاقت
گہ ملاحد کی تھی تردید کلام الحاد
گہ وجودی و شہودی سے بیان وحدت
جوں مہندس کبھی مالوف بشکل و مقدار
جوں محاسب کبھی معروف بضرب و قسمت
کبھی حرفوں سے تھا مطلوب مثال جفار
کبھی کچھ نقطے سے مقصود تھا رمال صفت
کبھی کرتا تھا قران مہ و زہرہ پہ نظر
کبھی تھا دیکھتا مریخ و زحل کی رجعت

کبھی افسون و عمزیمت کبھی تعویذ وطلسم
کبھی تجویز زکوۃ اور کبھی قصد دعوت
کبھی تھا علم قیافی میں یہ ادرک مجھے
ایک صورت سے بیاں کرتا تھا میں سو سیرت
کبھی میں رہتا سرودی میں تھا ایسا مشغول
کہ نہ تھی ایک نفس ضبط نفس سے فرصت
سیمیا سے کبھی تصویر کش موہومات
کیمیا سے کبھی میں زرکش گنج دولت
کبھی میں شیخ شیوخ اور کبھی شیخ رئیس
کبھی علّامہ کبھی صافی صوفیٔ طینت
کبھی میں قرب فرائض سے تھا عالی درجہ
کبھی میں قرب نوافل سے تھا اعلیٰ نیت
مائل موسیقی ایسا کہ ادا کرتا تھا
کبھی میں بارہ مقام اور کبھی چاروں مت
کبھی میں شاعر غزا و ادب دان بلیغ
نظم میں نام مرا نثر میں میری شہرت
کبھی کرتا تھا عروضی کا بھی میں قافیہ تنگ
طبع موزوں کی دکھاتا تھا جو موزونیت
کبھی پیش نظر انجیل و زبور و توریت
کبھی مصحف میں نظر میری سر ہر آیت
کبھی زردشتیوں میں ایسا کہ سارے موبد
زند و پازند میں کرتے تھے مری تبعیت

کبھی بہ آگہی شاستر و بید و پران
کروں اک بات سے پنڈت کی کتھا میں کھنڈت

کبھی میں نغز و معمہ میں نہایت ذی ہوش
کبھی اخبار و تواریخ میں صاحب خبرت

آخرش دیکھا تو **العلم حجاب الاکبر**
عاقبت پایا تو ہاں ابلہ کو اہلِ جنت

فائدہ کیا جو ہر اک علم کی جانی تعریف
فائدہ کیا جو ہر اک فن کی کھلے ماہیت

فائدہ کیا کہ جو دیکھے کتب ہر مذہب
فائدہ کیا جو ہوئی آگہی ہر ملّت

عقل سے گرچہ کیا مادہ کو ایسا پیدا
کہ بہر شکل ہو اک تازہ محل صورت

یا بنائی کوئی صورت کہ جسے دیکھ کے ہو
ہیکل روم سے بتخانہ چیں تک حیرت

بے مقدر نہ پڑے صورت بہبود نظر
دور آئینہ دل سے نہو رنگ کلفت

پڑھوں اک مطلع بر جستہ میں اس موقع پر
جس کو سن کر کہیں سب **احسنت** اہل فطنت

مطلع ثانی

گر نہ دے صاحب جوہر کہ مقدر عزت
جوہر فرد ہے بالعرض تو کیا بے قسمت

کیا ہوا علم مقولہ ہے اگر کیفیت
لیک بے یاوری بخت نہیں کیفیت

قاضی چرخ بھی جو تو ہے کیا گر تیری
مثل دھقان فلک رکھتے ہوں طالع نکبت

دور گردوں نہ موافق ہو تو ہو اور خفیف
جر اثقال میں تو جیسے اٹھائے محنت

آگے برگشتگی بخت کے چلنے کی نہیں
نظری و عملی کوئی بھی تیری حکمت

گو فصاحت میں تو سحبان ولے بے تقدیر
حرف مطلب پہ زباں کو ہو تری سو نکنت

گو ریاضی میں ہے صناع اگر بخت ہیں ید
نقش باطل ہے تری شکل وہ جس میں صنعت

کام تقویم نہ آئے نہ تری اصطرلاب
طالع بد سے اگر نیک نہ آئے ساعت

غالب

ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار
سایۂ لالہ بے داغ سویدائے بہار

مستیٔ باد صبا سے ہے بعرض سبزہ
ریزۂ شیشہ سے جوہر تیغ کہسار

سبز ہے جام زمرد کی طرح داغ پلنگ
تازہ ہے ریشۂ نارنج صفت روئے شرار

مستیٔ ابر سے گلچین طرب ہے حسرت
که اس آغوش میں ممکن ہے دو عالم کا فشار
کوہ و صحرا ہمه معمورئی شوق بلبل
راہ خوابیدہ ہوئی خندۂ گل سے بیدار
سونپے ہے فیض ہوا صورت مژگان یتیم
سرنوشت دو جہاں ابر به یک سطر غبار
کاٹ کر پھینکیے ناخن تو به انداز ہلال
قوت نامیه اس کو بھی نه چھوڑے بیکار
کف ہر خار به گردوں شدہ قمری پرواز
دام ہر کاغذ آتش زدہ طاؤس شکار
مے کدہ میں ہو اگر آرزوے گل چینی
بھول جا، یک قدح بادہ به طاق گلزار
موج گل ڈھونڈ به خلوت کدۂ غنچه باغ
گم کرے گوشۂ مے خانه میں گر تو دستار
کھینچے گر مانی اندیشه چمن کی تصویر
سبز مثل خط نوخیز ہو خط پرکار
لعل سے کی ہے پئے زمزمۂ مدحت شاہ
طوطیٔ سبزۂ کہسار نے پیدا منقار
وہ شہنشاہ که جس کی پئے تعمیر سرا
چشم جبریل ہوئی قالب خشت دیوار
فلک العرش ہجوم دوش مزدور
رشتۂ فیض ازل ساز طناب معمار

سبزۂ نہ چمن و یک خط پشت لب بام
رفعت ہمت صد عارف و یک اوج حصار
واں کے خاشاک سے حاصل ہو جسے یک پرکاہ
وہ رہے مروحہ بال پری سے بیزار
خاک صحرائے نجف جوہر سیر عرفا
چشم نقش قدم، آئینہ بخت بیدار
ذرہ اس گرد کا، خورشید کو آئینۂ ناز
گرد اس دشت کی امید کو احرامِ بہار
آفرینش کو ہے واں سے طلب مستی ناز
عرض خمیازۂ ایجاد ہے ہر موج بہار

مطلع ثانی

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار
دل پروانہ چراغاں پر بلبل گلزار
شکل طاؤس کرے آئینہ خانہ پرواز
ذوق میں جلوہ کے تیرے بہ ہوائے دیدار
تیری اولاد کے غم سے ہے بروئے گردوں
سلک اختر میں مہ نو مژۂ گوہر بار
ہم عبادت کو ترا نقش قدم مہر نماز
ہم ریاضت کو ترے حوصلہ سے استظہار
مدح میں تیری نہاں زمزمۂ نعت نبی
جام سے تیرے عیاں بادۂ جوش اسرار

جوہر دست دعا آئنہ یعنی تاثیر
یک طرف نازش مژگاں و دگر سو غم خار

مردمک سے ہو عزاخانۂ اقبال نگاہ
خاک درکی تری جو چشم نہ ہو آئنہ دار

دشمن آل نبیؐ کو بہ طرب خانۂ دہر
عرض خمیازہ سیلاب ہو طاق دیوار

دیدہ تا دل اسد آئنۂ یک پرتو شوق
فیض معنی سے خط ساغر راقم سرشار

---

(۲)

دہر جز جلوہ یکتائی معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

بے دلی ہائے تماشہ کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بم ہستی و عدم
لغو ہے آئینۂ فرق جنون و تمکیں

نقش معنی ہمہ خمیازۂ عرض صورت
سخن حق ہمہ پیمانۂ ذوقِ تحسیں

لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم
درد یک ساغر غفلت ہے چہ دنیا و چہ دیں

مثل مضمون وفا باد بہ دست تسلیم
صورت نقش قدم خاک بہ فرقِ تمکیں

عشق، بے ربطیٔ شیرازۂ اجزاے حواس
وصل، زنگار رخ آئنہ حسن یقیں
کوہ کن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب
بے ستون آئینہ خواب گران شیریں
کس نے دیکھا نفس اہلِ وفا آتش خیز!
کس نے پایا اثر نالہ دل ہاے حزیں !
سامع زمزمۂ اہل جہاں ہوں لیکن
نہ سر و برگ ستائش نہ دماغ نفریں
کس قدر ہرزہ سرا ہوں کہ عیاذاً باللہ
یک قلم خارج آداب وقار و تمکیں
نقش لاحول لکھ اے خامہ ہزیاں تحریر
یا علی عرض کر اے فطرت وسواس قریں
مظہر فیض خدا جان و دل ختم رسل
قبلہ آل نبی[۴] کعبہ ایجاد یقیں
ہو وہ سرمایہ ایجاد جہاں گرم خرام
ہر کف خاک ہے واں گردہ تصویر زمیں
جلوہ‌پرداز ہو نقش قدم اس کا جس جا
وہ کف خاک ہے ناموس دو عالم کی امیں
نسبت نام سے اس کی ہے یہ رتبہ کہ رہے
ابداً پشت فلک خم شدہ ناز زمیں
فیض خلق اس کا ہی شامل ہے کہ ہوتا ہے سدا
بوے گل سے نفس باد صبا عطر آگیں

برشِ تیغ کا اس کے ہے جہاں میں چرچا
قطع ہو جائے نہ سر رشتہ ایجاد کہیں

کفر سوز اس کا وہ جلوہ ہے کہ جس سے ٹوٹے
رنگ عاشق کی طرح رونقِ بتخانۂ چیں

جاں پناہا! دل و جاں فیض رسانا! شاہا!
وصیٔ ختم رسل تو ہے بہ فتوائے یقیں

جسمِ اطہر کو ترے دوش پیمبر منبر
نام نامی کو ترے ناصیۂ عرش نگیں

کس سے ممکن ہے تری مدح بغیر از واجب
شعلۂ شمع مگر شمع پہ باندھے آئیں

آستاں پر ہے ترے جوہرِ آئنۂ سنگ
رقم بندگی حضرتِ جبریلِ امیں

تیرے در کے لیے اسباب نثار آمادہ
خاکیوں کو جو خدا نے دیے جان و دل و دیں

تیری مدحت کے لیے ہیں دل و جاں کام و زباں
تیری تسلیم کو ہیں لوح و قلم دست و جبیں

کس سے ہو سکتی ہے مداحی ممدوحِ خدا!
کس سے ہو سکتی ہے آرائشِ فردوسِ بریں

جنس بازار معاصی اسداللہ اسد
کہ سوا تیرے کوئی اس کا خریدار نہیں

شوخیٔ عرض مطالب میں ہے گستاخ طلب
ہے تیرے حوصلۂ فضل پر از بس کہ یقیں

دے دعا کو مری وہ مرتبہ حسن قبول
که اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمیں
غم شبیر سے ہو سینہ یہاں تک لبریز
که رہیں خون جگر سے مری آنکھیں رنگیں
طبع کو الفت دلدل میں یہ سر گرمی شوق
که جہاں تک چلے اس سے قدم اور مجھ سے جبیں
دل الفت نسب و سینۂ توحید فضا
نگہ جلوہ پرست و نفس صدق گزیں
صرف عدا، اثر شعلہ دود دوزخ
وقف احباب گل و سنبل فردوس بریں

مرثیہ

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کے رخ بے حجاب نے
دیکھا سوے فلک شہ گردوں رکاب نے
مڑ کر صدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثناے خدا کرو
اٹھو فریضہ سحری کو ادا کرو

ہاں غازیو یہ دن ہے جدال و قتال کا
یاں خوں بہے گا آج محمدؐ کی آل کا
چہرہ خوشی سے سرخ ہے زہرا کے لال کا
گذری شب فراق دن آیا وصال کا

هم وہ ہیں غم کریں گے ملک جن کے واسطے
راتیں تڑپ کے کاٹی ہیں اس دن کے واسطے

یہ صبح ہے وہ صبح مبارک ہے جس کی شام
یاں سے ہوا جو کوچ تو ہے خلد میں مقام
کوثر پہ آبرو سے پہنچ جائیں تشنہ کام
لکھے خدا نماز گذاروں میں سب کے نام

سب ہیں وحید عصر یہ غل چار سو اٹھے
دنیا سے جو شہید اٹھے سرخرو اٹھے

یہ سن کے بستروں سے اٹھے وہ خدا شناس
اک اک نے زیب جسم کیا فاخرہ لباس
شانے محاسنوں میں کیے سب نے بے ہراس
باندھے عمامے آئے امام زماں کے پاس

رنگیں عبائیں دوش پہ کمریں کسے ہوے
مشک و زباد و عطر میں کپڑے بسے ہوے

سوکھے لبوں پہ حمدالٰہی رخوں پہ نور
خوف و ہراس و رنج و کدورت دلوں سے دور
فیاض حق شناس اولوالعزم ذی شعور
خوش فکر و بذلہ سنج و ہنر پرور و غیور

کانوں کو حسن صوت سے خط برملا ملے
باتوں میں وہ نمک کہ دلوں کو مزا ملے

پانی نہ تھا وضو جو کریں وہ فلک جناب
پر تھی رخوں پہ خاک تیمم سے طرفہ آب

باریک ابر میں نظر آتے تھے آفتاب
ہوتے ہیں خاکسار غلام ابوتراب
مہتاب سے رخوں کی صفا اور ہوگئی
مٹی سے آئینوں میں جلا اور ہوگئی

خیمے سے نکلے شہ کے عزیزان خوش‌خصال
جنمیں کئی تھے حضرت خیرالنساء کے لال
قاسم سا گلبدن علی اکبر سا خوش جمال
اک جا عقیل و مسلم و جعفر کے نو نہال
سبکے رخوں کا نور سپہر بریں پہ تھا
اٹھارہ آفتابوں کا جھرمٹ زمیں پہ تھا

وہ صبح اور وہ چھانوں ستارونکی اور وہ نور
دیکھے تو غش کرے ارنی گوے اوج طور
پیدا گلوں سے قدرت اللہ کا ظہور
وہ جا بجا درختوں پہ تسبیح خواں طیور
گلشن خجل تھے وادی مینو اساس سے
جنگل تھا سب بسا ہوا پھولوں کی باس سے

ٹھنڈی ہوا میں سبزا صحرا کی وہ لہک
شرماے جس سے اطلس زنگاری فلک
وہ جھومنا درختوں کا پھولوں کی وہ مہک
ہر برگ گل پہ قطرہ شبنم کی وہ جھلک
ہیرے خجل تھے گوہر یکتا نثار تھے
پتے بھی ہر شجر کے جواہر نگار تھے

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا
دُرّاج و کبک و تیہو و طاؤس کی صدا
وہ جوش گل وہ نالہ مرغان خوشنوا
سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں سے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدگل فروش تھے

وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار
پھولوں پہ جابجا وہ گہر ہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار
بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے نخل گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیئے تھے کٹورے گلاب کے

وہ قمریوں کا چار طرف سرو کے ہجوم
کوکو کا شور نالہ **حق سرہٗ** کی دھوم
سبحان ربنا کی صدا تھی علی‌العموم
جاری تھے وہ جو انکی عبادت کے تھے رسوم
کچھ گل فقط نہ کرتے تھے رب علا کی مدح
ہر خار کو بھی نوک زباں تھی خدا کی مدح

ناگاہ چرخ پر خط ابیض ہوا عیاں
تشریف جانماز پر لائے شہ زماں
سجادے بچھ گئے عقب شاہ انس و جاں
صوت حسن سے اکبر مہرو نے دی اذاں

ہر اک کی چشم آنسوؤں سے ڈبڈبا گئی
گویا صدا رسول ؐ کی کانوں میں آگئی

چپ تھے طیور جھومتے تھے وجد میں شجر
تسبیح خواں تھے برگ و گل و غنچہ و ثمر
محو ثنا کلوخ و نباتات و دشت و در
پانی سے منھ نکالے تھے دریا کے جانور
اعجاز تھا کہ دلبر شبیر کی صدا
ہر خشک و تر سے آتی تھی تکبیر کی صدا

صف میں ہوا جو نعرۂ قد قامت الصلوٰۃ
قائم ہوئی نماز اٹھے شاہ کائنات
وہ نور کی صفیں وہ مصلی ملک صفات
قدموں سے جنکے ملتی تھی آنکھیں رہ نجات
جلوہ تھا تا بہ عرش معلی حسین کا
مصحف کی لوح تھی کہ مصلیٰ حسین کا

ہاتھ انکے جب قنوت میں اٹھے سوے خدا
خود ہو گئے فلک پہ اجابت کے باب وا
تھرائے آسمان، ہلا عرش کبریا
شہپر تھے دونوں ہاتھ بے طائر دعا
وہ خاکسار محو تضرع تھے فرش پر
روح القدس کی طرح دعائیں تھیں عرش پر

فارغ ہوے نماز سے جب قبلہ انام
آئے مصافحے کو جوانان تشنہ کام

چومے کسی نے دست شہنشاہ خاص و عام
آنکھیں ملیں کسی نے قدم پر باحترام
کیا دل تھے کیا سپاہ رشید و سعید تھی
باہم معانقے تھے کہ مرنے کی عید تھی

سجدے میں شکر کے تھا کوئی مرد با خدا
پڑھتا تھا کوئی حزن سے قرآن کوئی دعا
نعت نبی کہیں تھی کہیں حمد کبریا
سولا اٹھا کے ہاتھ یہ کرتے تھے التجا
فاقوں میں تشنہ کامی غربت پہ رحم کر
یارب مسافروں کی جماعت پہ رحم کر

زاری تھی التجا تھی مناجات تھی ادھر
واں صف کشی و ظلم و تعدی و شور و شر
کہتا تھا ابن سعد یہ جا جا کے نہر پر
گھاٹوں سے ہوشیار ترائی سے باخبر
دو روز سے ہے تشنہ دہانی حسین کو
ہاں مرتے دم بھی دیجو نہ پانی حسین کو

بیٹھے تھے جانباز پہ شاہ فلک سریر
ناگہ قریب آ کے گرے تین چار تیر
دیکھا ہر اک نے مڑ کے سوئے لشکر شریر
عباس اٹھے تول کے شمشیر بے نظیر
پروانہ تھے سراج امامت کے نور پر
روکی سپر حضور کرامت ظہور پر

اکبر سے مڑ کے کہنے لگے سرور زماں
باندھے ہے سرکشی پہ کمر لشکر گراں
تم جا کے کہدو خیمے میں یہ اے پدر کی جاں
بچوں کو لے کے صحن سے ہٹ جائیں بیبیاں
غفلت میں تیر سے کوئی بچہ تلف نہ ہو
ڈر ہے مجھے کہ گردن اصغر ہدف نہ ہو

فرما کے یہ حرم میں گئے شاہ بحر و بر
ہونے لگیں صفوں میں کمربندیاں ادھر
جوشن پہن کے حضرت عباس نامور
دروازے پر ٹہلنے لگے مثل شیر نر
پرتو سے رخ کے برق چمکتی تھی خاک پر
تلوار ہاتھ میں تھی سپر دوش پاک پر

شوکت میں رشک تاج سلیماں تھا خود سر
کلغی پہ لاکھ بار تصدق ہما کے پر
دستانے دونوں فتح کا مسکن ظفر کا گھر
وہ رعب الاماں وہ تہور کہ الحذر
جب ایسا بھائی ظلم کی تیغوں میں آڑ ہو
پھر کسطرح نہ بھائی کی چھاتی پہاڑ ہو

خیمے میں جاکے شہ نے دیکھا حرم کا حال
چہرے تو فق ہیں اور کھلے ہیں سروں کے بال
زینب کی یہ دعا ہے کہ اے رب ذوالجلال
بچ جائے اس فساد سے خیرالنساء کا لال

بانوے نیک نام کی کھیتی ہری رہے
صندل سے مانگ بچوں سے گودی بھری رہے

آفت میں ہے مسافر صحرائے کربلا
بیکس پہ یہ چڑھائی ہے سید پہ یہ جفا
غربت میں ٹھن گئی جو لڑائی تو ہوگا کیا
ان ننھے ننھے بچوں پہ کر رحم اے خدا

فاقوں سے جاں بلب ہیں عطش سے ہلاک ہیں
یارب ترے رسول کی یہ آل پاک ہیں

سر پر نہ اب علی نہ رسول فلک وقار
گھر لٹ گیا گذر گئیں خاتون روزگار
اماں کے بعد روئی حسن کو میں سوگوار
دنیا میں اب حسین ہے ان سب کا یادگار

تو داد دے مری کہ عدالت پناہ ہے
کچھ اس پہ بن گئی تو یہ مجمع تباہ ہے

بولے قریب جا کے شہ آسماں جناب
مضطر نہو دعائیں ہیں تم سبکی مستجاب
مغرور ہیں خطا پہ ہیں یہ خانماں خراب
خود جا کے میں دکھاتا ہوں انکو رہ صواب

موقع نہیں بہن ابھی فریاد و آہ کا
لاؤ تبرکات رسالت پناہ کا

معراج میں رسول نے پہنا تھا جو لباس
کشتی میں لائیں زینب اسے شاہ دیں کے پاس

سر پر رکھا عمامہ سردار حق شناس
پہنی قبائے پاک رسولؐ فلک اساس
بر میں درست و چست تھا جامہ رسولؐ کا
رومال فاطمہ کا عمامہ رسولؐ کا

پوشاک سب پہن چکے جس دم شہِ زمن
لے کر بلائیں بھائی کی رونے لگی بہن
چلائی ہائے آج نہیں حیدر و حسن
اماں کہاں سے لائے تمہیں اب یہ بیوطن
رخصت ہے اب رسول کے یوسف جمال کی
صدقے گئی بلائیں تو لو اپنے لال کی

یاد آگئے علی نظر آئی جو ذوالفقار
قبضے کو چوم کر شہ دیں روئے زار زار
تولی جو لے کے ھاتھ میں شمشیر آبدار
شوکت نے دی صدا کہ تری شان کے نثار
فتح و ظفر قریب ہو نصرت قریب ہو
زیب اسکی تجھ کو، ضرب عدو کو نصیب ہو

باندھی کمر سے تیغ جو زہرا کے لال نے
پھاڑا فلک پہ اپنا گریباں ھلال نے
دستانے پہنے سرور قدسی خصال نے
معراج پائی دوش پہ حمزہ کی ڈھال نے
رتبہ بلند تھا کہ سعادت نشان تھی
ساری سپر میں مہر نبوت کی شان تھی

مولا چڑھے فرس پہ محمدؐ کی شان سے
ترکش لگایا ہر نے پہ کس آن بان سے
نکلا یہ جن و انس و ملک کی زبان سے
اترا ہے پھر زمیں پہ براق آسماں سے
سارا چلن خرام سیں کبک دری کا ہے
گھونگھٹ نئی دولھن کا ہے چہرہ پری کا ہے

اللہ ری سپاہ خدا کی شکوہ و شان
بجھنے لگے جنود ضلالت کے بھی نشان
کمریں کسے علم کے تلے ہاشمی جوان
دنیا کی زیب، دین کی عزت، جہاں کی جان
ایک ایک دودمان علی کا چراغ تھا
جس کو بہشت پر تھا تفوق وہ باغ تھا

ناگاہ تیر ادھر سے چلے جانب امام
گھوڑا بڑھا کے آپ نے حجت بھی کی تمام
نکلے ادھر سے شہ کے رفیقان تشنہ کام
بے سر ہوئے پروں میں سران سپاہ شام
بالا کبھی تھی تیغ کبھی زیر تنگ تھی
اک اک کی جنگ مالک اشتر کی جنگ تھی

نکلے پئے جہاد عزیزان شاہ دیں
نعرے کیے کہ خوف سے ہلنے لگی زمیں
روباہ کی صفوں پہ چلے شیر خشم گیں
کھینچی جو تیغ بھول گئے صف کشی لعیں

بجلی گری پروں پہ شمال و جنوب کے
کیا کیا لڑے ہیں شام کے بادل میں ڈوب کے

اللہ رے علی کے نواسوں کی کارزار
دونوں کے نیمچے تھے کہ چلتی تھی ذوالفقار
شانہ کٹا کسی نے جو روکا سپر پہ وار
گنتی تھی زخمیوں کی نہ کشتوں کا کچھ شمار

اتنے سوار قتل کیے تھوڑی دیر میں
دونوں کے گھوڑے چھپ گئے لاشوں کے ڈھیر میں

کس حُسن سے حُسن کا جوان حسین لڑا
گھر گھر کے صورت اسد خشم گیں لڑا
دو دن کی بھوک پیاس میں وہ مہ جبیں لڑا
سہرا الٹ کے یوں کوئی دولھا نہیں لڑا

حملے دکھا دیے اسد کردگار کے
مقتل میں سوئے ازرق شامی کو مار کے

چمکی جو تیغ حضرت عباس عرش جاہ
روح الامیں پکارے کہ اللہ کی پناہ
ڈھالوں میں چھپ گیا پسر سعد روسیاہ
کشتوں سے بند ہو گئی امن و امان کی راہ

جھپٹا جو شیر شوق میں دریا کی سیر کے
لے لی ترائی تیغوں کی موجوں میں پیر کے

بے سر ہوئے موکل سر چشمہ فرات
ہل چل میں مثل موج صفوں کو نہ تھا ثبات

دریا میں گر کے ڈوب گئے کتنے بدصفات
گویا حباب ہو گئے تھے نقطۂ حیات

عباس بھر کے مشک کو یوں تشنہ لب لڑے
جس طرح نہرواں میں امیر عرب لڑے

آفت تھی ضرب و حرب علی اکبر دلیر
غصے میں جھپٹے صید پہ جیسے گرسنہ شیر
سب سر بلند پست زبردست سب تھے زیر
جنگل میں چار سمت ہوے زخمیوں کے ڈھیر

سر انکے اترے تن سے جو تھے رن چڑھے ہوے
عباس سے بھی جنگ میں کچھ تھے بڑھے ہوے

تلواریں برسیں صبح سے نصف النہار تک
ہلتی رہی زمیں لرزتے رہے فلک
کانپا کیے پروں کو سمیٹے ہوے ملک
نعرے نہ پھر وہ تھے نہ وہ تیغوں کی تھی چمک

ڈھالوں کا دور برچھیوں کا اوج ہوگیا
ہنگامِ ظہر خاتمۂ فوج ہوگیا

لاشے سبھوں کے سبط نبی خود اٹھا کے لائے
قاتل کسی شہید کا سر کاٹنے نہ پائے
دشمن کو بھی نہ دوست کی فرقت خدا دکھائے
فرماتے تھے بچھڑ گئے سب ہم سے ہائے ہائے

اتنے پہاڑ گر پڑیں جس پر وہ خم نہ ہو
گر سو برس جیوں تو یہ مجمع بہم نہ ہو

لاشے تو سب کے گرد تھے اور بیچ میں امام
ڈوبی ہوئی تھی خوں میں نبی کی قبا تمام
افسردہ و حزیں و پریشاں و تشنہ کام
برچھی تھی دل کو فتح کے باجوں کی دھوم دھام

اعداء کسی شہید کا جب نام لیتے تھے
تھرا کے دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیتے تھے

مقتل سے آئے خیمے کے در پر شۂ زمن
پر شدت عطش سے نہ تھی طاقت سخن
پردے پہ ہاتھ رکھ کے پکارے بصد محن
اصغر کو گاہوارے سے لے آؤ اے بہن

پھر ایک بار اس مہ انور کو دیکھ لیں
اکبر کے شیر خوار برادر کو دیکھ لیں

خیمے سے دوڑی آل محمدؐ برہنہ سر
اصغر کو لائیں ہاتھوں پہ بانوے نوحہ گر
بچے کو لے کے بیٹھ گئے آپ خاک پر
منہ سے ملے جو ہونٹھ تو چونکا وہ سیمبر

غم کی چھری چلی جگر چاک چاک پر
بٹھلا لیا حسین نے زانوے پاک پر

بچے سے ملتفت تھے شہ آسماں سریر
تھا اس طرف کمیں میں بن کاہل شریر
مارا جو تین پھال کا اس بے حیا نے تیر
بس دفعتاً نشانہ ہوئی گردن صغیر

تڑپا جو شیر خوار تو حضرت نے آہ کی
معصوم ذبح ہو گیا گودی میں شاہ کی

جس دم تڑپ کے مر گیا وہ طفل شیر خوار
چھوٹی سی قبر تیغ سے کھودی بحال زار
بچے کو دفن کر کے پکارا وہ ذی وقار
اے خاک پاک حرمت سہاں نگاہ دار

دامن میں رکھ اسے جو محبت علی کی ہے
دولت ہے فاطمہ کی امانت نبی کی ہے

پہلے پہل چھٹا ہے یہ ماں کے کنار سے
واقف نہیں ہے قبر کی شبہاے تار سے
اے قبر ہوشیار مرے گلعذار سے
گردن چھدی ہوئی ہے بچانا فشار سے

سید ہے لال حضرت خیرالنسا کا ہے
معصوم ہے شہید ہے بندہ خدا کا ہے

یہ کہہ کے آئے فوج پہ تولے ہوے حسام
آنکھیں لہو تھیں رونے سے چہرہ تھا سرخ فام
زیب بدن کئے تھے بصد عز و احتشام
پیراہن مطہر پیغمبر انام

حمزہ کی ڈھال تیغ شۂ لافتا کی تھی
بر میں زرہ جناب رسول خداؐ کی تھی

رستم تھا درع پوش کہ پاکھر میں راہوار
جرار بردبار سبک رو وفا شعار

کیا خوشنما تھا زین طلاکار و نقرہ کار
اکسیر تھا قدم کا جسے مل گیا غبار
خوشخو تھا خانہ زاد تھا دلدل نژاد تھا
شبیر بھی سخی تھے فرس بھی جواد تھا

گرمی کا روز جنگ کی کیونکر کروں بیاں
ڈر ہے کہ مثل شمع نہ جلنے لگے زباں
وہ لو کہ الحذر وہ حرارت کہ الاماں
رن کی زمیں تو سرخ تھی اور زرد آسماں
آب خنک کو خلق ترستی تھی خاک پر
گویا ہوا سے آگ برستی تھی خاک پر

وہ لو وہ آفتاب کی حدت وہ تاب و تب
کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب
خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا

جھیلوں سے چارپائے نہ اٹھتے تھے تا بہ شام
مسکن میں مچھلیوں کے سمندر کا تھا مقام
آہو جو کاہلے تھے تو چیتے سیاہ فام
پتھر پگل کے رہ گئے تھے مثل موم خام
سرخی اڑی تھی پھولوں سے سبزی گیاہ سے
پانی کنوؤں میں اترا تھا سائے کی چاہ سے

کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ و بار
ایک ایک نخل جل رہا تھا صورت چنار
ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار
کانٹا ہوئی تھی سوکھ کے ہر شاخ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثل چہرۂ مدقوق زرد تھے

شیر اٹھتے تھے نہ دھوپ کے مارے کچھار سے
آہو نہ منھ نکالتے تھے سبزہ زار سے
آئینہ مہر کا تھا مکدر غبار سے
گردوں کو تپ چڑھی تھی زمیں کے بخار سے
گرمی سے مضطرب تھا زمانہ زمین پر
بھن جاتا تھا جو گرتا تھا دانہ زمین پر

گرداب پر تھا شعلہ جوالہ کا گماں
انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
منھ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں
تہ پر تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمی روز حساب تھی
ماہی جو سیخ موج تک آئی کباب تھی

اس دھوپ میں کھڑے تھے اکیلے شہ امم
نہ دامن رسولؐ تھا نہ سایۂ علم
شعلے جگر سے آہ کے اٹھتے تھے دمبدم
اودے تھے لب زباں میں کانٹے کمر میں خم

بے آب تیسرا تھا جو دن مہمان کو
ہوتی تھی بات بات میں لکنت زبان کو
گھوڑوں کو اپنے کرتے تھے سیراب سب سوار
آتے تھے اونٹ گھاٹ پہ باندھے ہوئے قطار
پیتے تھے آب نہر پرند آ کے بیشمار
سقے زمیں پہ کرتے تھے چھڑکاؤ بار بار
پانی کا دام و دد کو پلانا ثواب تھا
اک ابن فاطمہ کے لیے قحط آب تھا

سر پر لگائے تھا پسر سعد چتر زر
خادم کئی تھے مروحہ جنباں ادھر ادھر
کرتے تھے آب‌پاش مکرر زمیں کو تر
فرزند فاطمہ پہ نہ تھا سایۂ شجر
وہ دھوپ دشت کی وہ جلال آفتاب کا
سونلا گیا تھا رنگ مبارک جناب کا

کہتا تھا ابن‌سعد کہ اے آسماں جناب
بیعت جو کیجیے اب بھی تو حاضر ہے جام آب
فرماتے تھے حسین کہ او خانماں خراب
دریا کو خاک جانتے ہیں ابن‌بوتراب
فاسق ہے پاس کچھ تجھے اسلام کا نہیں
آب بقا ہو یہ تو مرے کام کا نہیں

کہہ دوں تو خوان لے کے خود آئیں ابھی خلیل
چاہوں تو سلسبیل کو دم میں کروں سبیل

کیا جام آب کا تو مجھے دے گا او ذلیل
بےآبرو خسیس ستمگر دنی بخیل
جس پھول پر پڑے ترا سایہ وہ بو نہ دے
کھلوائے فصد تو تو کبھی رگ لہو نہ دے

فرما کے یہ نگاہ جو کی سوے ذوالفقار
تھرا کے پچھلے پانوں ہٹا وہ ستم شعار
مظلوم پہ صفوں سے چلے تیر بیشمار
آواز کوس حرب ہوئی آسماں کے پار
نیزے اٹھا کے جنگ پہ اسوار تل گئے
کالے نشاں فوج سیہ رو کے کھل گئے

وہ دھوم طبل جنگ کی وہ بوق کا خروش
کر ہوگئے تھے شور سے کروبیوں کے گوش
تھرائی یوں زمیں کہ اڑے آسماں کے ہوش
نیزے ہلا کے نکلے سواران درع پوش
ڈھالیں تھیں یوں سروں پہ سواران شوم کے
صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے

جب رن میں تیغ تول کے سلطان دیں بڑھے
گیتی کے تھام لینے کو روح الامیں بڑھے
مانند شیرنر کہیں ٹھہرے کہیں بڑھے
گویا علی الٹتے ہوے آستیں بڑھے
جلوہ دیا جری نے عروس مصاف کو
مشکل کشا کی تیغ نے چھوڑا غلاف کو

کاٹھی سے اس طرح ہوئی وہ شعلہ خو جدا
جیسے کنار شوق سے ہو خوبرو جدا
مہتاب سے شعاع جدا گل سے بو جدا
سینے سے دم جدا رگ‌جاں سے لہو جدا

گرجا جو رعد ابر سے بجلی نکل پڑی
محمل میں دم جو گھٹ گیا لیلیٰ نکل پڑی

آئے حسین یوں کہ عقاب آئے جس طرح
کافر پہ کبریا کا عتاب آئے جس طرح
تابندہ برق سوے سحاب آئے جس طرح
دوڑا فرس نشیب میں آب آئے جس طرح

یوں تیغ تیز کوند گئی اس گروہ پر
بجلی تڑپ کے گرتی ہے جس طرح کوہ پر

جس پر چلی وہ تیغ دوپارا کیا اسے
کھنچتے ہی چار ٹکڑے دوبارا کیا اسے
واں تھی جدھر اجل نے اشارا کیا اسے
سختی بھی کچھ پڑی تو گوارا کیا اسے

نے زین تھا نہ فرس تھا نہ اسوار زین پر
کڑیاں زرہ کی بکھری ہوئی تھیں زمیں پر

آئی چمک کے غول پہ جب سر گرا گئی
دم میں جمی صفوں کو برابر گرا گئی
ایک ایک قصر تن کو زمیں پر گرا گئی
سیل آئی زور شور سے جب گھر گرا گئی

آ پہونچا اس کے گھاٹ پہ جو مر کے رہ گیا
دریا لہو کا تیغ کے پانی سے بہ گیا
قلب و جناح میمنہ و میسرہ تباہ
گردن کشان امت خیرالوریٰ تباہ
جنباں زمیں صفیں تہ و بالا پرا تباہ
بے جان جسم روح مسافر سرا تباہ
بازار بند ہو گئے جھنڈے اکھڑ گئے
فوجیں ہوئیں تباہ محلے اجڑ گئے
بچھ بچھ گئیں صفوں پہ صفیں وہ جہاں چلی
چمکی تو اس طرف ادھر آئی وہاں چلی
دونوں طرف کی فوج پکاری کہاں چلی
اس نے کہا یہاں وہ پکارا وہاں چلی
منہ کس طرف ہے تیغ زنوں کو خبر نہ تھی
سر گر رہے تھے اور تنوں کو خبر نہ تھی
دشمن جو گھاٹ پر تھے وہ دھوئے تھے جانسے ہاتھ
گردن سے سر الگ تھا جدا تھے نشاں سے ہاتھ
توڑا کبھی جگر کبھی چھیدا سناں سے ہاتھ
جب کٹکے گر پڑیں تو پھر آئیں کہانسے ہاتھ
اب ہاتھ دستیاب نہ تھے منہ چھپانے کو
ہاں پانوں رہ گئے تھے فقط بھاگ جانیکو
اللہ رے خوف تیغ شہ کائنات کا
زہرہ تھا آب خوف کے مارے فرات کا

دریا میں حال یہ تھا ہر اک بدصفات کا
چارہ فرار کا تھا نہ یارا ثبات کا
غل تھا کہ برق گرتی ہے ہر درع پوش پر
بھاگو خدا کے قہر کا دریا ہے جوش پر

تیر افگنی کا جن کی ہر اک شہر میں تھا شور
گوشہ کہیں نہ ملتا تھا ان کو سوائے گور
تاریک شب میں جن کا نشانہ تھا پائے مور
لشکر میں خوف جاں نے انہیں کر دیا تھا کور
ہوش اڑ گئے تھے فوج ضلالت نشان کے
پیکاں میں زہ کو رکھتے تھے سوفار جان کے

صف پر صفیں پروں پہ پرے پیش و پس گرے
اسوار پر سوار فرس پر فرس گرے
اٹھ کر زمیں سے پانچ جو بھاگے تو دس گرے
مخبر پہ پیک پیک پہ مر کر عسس گرے
ٹوٹے پرے شکست بنائے ستم ہوئی
دنیا میں اس طرح کی بھی افتاد کم ہوئی

غصے تھا شیر شرزہ صحرائے کربلا
چھوڑے تھا گرگ منزل و ماوائے کربلا
تیغ علی تھی معرکہ آرائے کربلا
خالی نہ تھی سروں سے کہیں جائے کربلا
بستی بسی تھی مردوں کے قریے اجاڑ تھے
لاشوں کی تھی زمیں سروں کے پہاڑ تھے

سقے پکارتے تھے یہ مشکیں لئے ادھر
بازار جنگ گرم ہے ڈھلتی ہے دوپہر
پیاسا جو ہو وہ پانی سے ٹھنڈا کرے جگر
مشکوں پہ دوڑ دوڑ کے گرتے تھے اہل شر
کیا آگ لگ گئی تھی جہان خراب کو
پیتے تھے سب، حسین ترستے تھے آب کو

گرمی میں پیاس تھی کہ پھنکا جاتا تھا جگر
اف اف کبھی کہا کبھی چہرے پہ لی سپر
آنکھوں میں ٹیس اٹھی جو پڑی دھوپ پر نظر
جھپٹے کبھی ادھر کبھی حملہ کیا ادھر
کثرت عرق کے قطروں کی تھی روئے پاک پر
موتی برستے جاتے تھے مقتل کی خاک پر

سیراب چھپتے پھرتے تھے پیاسے کی جنگ سے
چلتی تھی ایک تیغ علی لاکھ رنگ سے
چمکی جو فرق پر تو نکل آئی تنگ سے
رکتی نہ تھی سپر سے نہ آہن نہ سنگ سے
خالق نے منہ دیا تھا عجب آب و تاب کا
خود اس کے سامنے تھا پھپھولا حباب کا

گھوڑے کی وہ تڑپ وہ چمک تیغ تیز کی
سو سو صفیں کچل گئیں جب جست و خیز کی
لاکھوں میں تھی نہ ایک کو طاقت ستیز کی
تھی چار سمت دھوم گریزا گریز کی

آری جو ہوگئی تھیں وہ سب ذوالفقار سے
تیغوں نے منھ پھرا لئے تھے کارزار سے

اللہ ری لڑائی میں شوکت جناب کی
سونلاے رنگ میں تھی ضیا آفتاب کی
سوکھے وہ لب کہ پنکھڑیاں تھیں گلاب کی
تصویر ذوالجناح پہ تھی بوتراب کی

ہوتا تھا غل جو کرتے تھے نعرے لڑائی میں
بھاگو کہ شیر گونج رہا ہے ترائی میں

پھر تو یہ غل ہوا کہ دھائی حسین کی
اللہ کا غضب تھا لڑائی حسین کی
دریا حسین کا ہے ترائی حسین کی
دنیا حسین کی ہے خدائی حسین کی

بیڑا بچایا آپ نے طوفاں سے نوح کا
اب رحم واسطہ علی اکبر کی روح کا

اکبر کا نام سن کے جگر پر لگی سناں
آنسو بھر آئے روک لی رہوار کی عناں
مڑ کر پکارے لاش پسر کو شہ زماں
تم نے نہ دیکھی جنگ پدر اے پدر کی جاں

قسمیں تمہاری روح کی یہ لوگ دیتے ہیں
لو اب تو ذوالفقار کو ہم روک لیتے ہیں

چلایا ہاتھ مار کے زانو پہ ابن‌سعد
اے وافضیحتا یہ ہزیمت ظفر کے بعد

زیبا دلاوروں کو نہیں ہے خلاف وعد
اک پہلواں یہ سنتے ہی گرجا مثال رعد
نعرہ کیا کہ کرتا ہوں حملہ امام پر
اے ابن سعد لکھ لے ظفر میرے نام پر

بالا قد و کلفت و تنومند و خیرہ سر
روئیں تن و سیاہ دروں آہنی کمر
ناوک پیام مرگ کے ترکش اجل کا گھر
تیغیں ہزار ٹوٹ گئیں جس پہ وہ سپر
دل میں بدی طبیعت بد میں بگاڑ تھا
گھوڑے پہ تھا شقی کہ ہوا پر پہاڑ تھا

ساتھ اسکے اور اس قد و قامت کا ایک یل
آنکھیں کبود رنگ سیہ ابروؤں پہ بل
بدکار و بدشعار و ستمگار و پردغل
جنگ آزما بھگائے ہوئے لشکروں کے دل
بھالے لئے کسے ہوئے کمریں ستیز پر
نازاں وہ ضرب گرز پہ یہ تیغ تیز پر

نیزہ ہلا کے شاہ پر آیا وہ خود پسند
مشکلکشا کے لال نے کھولے تمام بند
تیر و کماں سے بھی نہ ہوا کچھ وہ بہرہ مند
چلہ ادھر کھنچا کہ چلی تیغ سربلند
وہ تیر کٹ گئے جو در آتے تھے سنگ میں
گوشے نہ تھے کماں میں نہ پیکاں خدنگ میں

ظالم اٹھا کے گرز کو آیا جناب پر
طاری ہوا غضب خلف بوتراب پر
مارا جو ہاتھ پاؤں جما کر رکاب پر
بجلی گری شقی کے سر پرعتاب پر
بد ہاتھ میں شکست، ظفر نیک ہاتھ میں
ہاتھ اڑ کے جا پڑا کئی ہاتھ ایک ہاتھ میں

کچھ دست پاچہ ہو کے چلا تھا وہ نابکار
پنجے سے پر اجل کے کہاں جا سکے شکار
واں اس نے بائیں ہاتھ میں لی، تیغ آبدار
یاں سر سے آئی پشت کے مہروں پہ ذوالفقار
قربان تیغ تیز شہ نامدار کے
دو ٹکڑے تھے سوار کے دو راہوار کے

پھر دوسرے پہ گرز اٹھا کر پکارے شاہ
کیوں ضرب ذوالفقار پہ تو نے بھی کی نگاہ
سر شار تھا شراب تکبر سے روسیاہ
جاتا کہاں کہ موت تو روکے ہوئے تھی راہ
غل تھا اسے اجل نے بڑھایا جو گھیر کے
لو دوسرا شکار چلا منھ میں شیر کے

آتا تھا وہ کہ اسپ شہ دیں پلٹ پڑا
ثابت ہوا کہ شیر گرسنہ جھپٹ پڑا
تیغہ شقی نے ڈھال پہ مارا تو پٹ پڑا
ضربت پڑی کہ گنبد دوار پھٹ پڑا

پیوند صدر زیں جسد و فرق ہو گیا
گھوڑا زمیں سے سینے تلک غرق ہو گیا

آئی ندائے غیب کہ شبیر مرحبا
اس ہاتھ کے لئے تھی یہ شمشیر مرحبا
یہ آبرو یہ جنگ یہ توقیر مرحبا
دکھلا دی ماں کے دودھ کی تاثیر مرحبا

غالب کیا خدا نے تجھے کائنات پر
بس خاتمہ جہاد کا ہے تری ذات پر

بس اب نہ کر وغا کی ہوس اے حسین بس
دم لے ہوا میں چند نفس اے حسین بس
گرمی سے ہانپتا ہے فرس اے حسین بس
وقت نماز عصر ہے بس اے حسین بس

پیاسا لڑا نہیں کوئی یوں ازدحام میں
اب اہتمام چاہیے امت کے کام میں

لبیک کہہ کے تیغ رکھی شہ نے میان میں
پلٹی سپاہ آئی قیامت جہان میں
پھر سرکشوں نے تیر ملائے کمان میں
پھر کھل گئے لپٹ کے پھریرے نشان میں

بیکس حسین ظلم شعاروں میں گھر گئے
مولا تمہارے لاکھ سواروں میں گھر گئے

سینے پہ سامنے سے چلے دس ہزار تیر
چھاتی پہ لگ گئے کئی سو ایک بار تیر

پہلو کے پار برچھیاں سینے کے پار تیر
پڑتے تھے دس جو کھینچتے تھے تن سے چار تیر
یوں تھے خدنگ ظل الٰہی کے جسم پر
جس طرح خار ہوتے ہیں ساھی کے جسم پر

چلتے تھے چار سمت سے بھالے حسین پر
ٹوٹے ہوے تھے برچھیوں والے حسین پر
یہ دکھ نبی کی گود کے پالے حسین پر
قاتل تھے خنجروں کو نکالے حسین پر
تیر ستم نکالنے والا کوئی نہ تھا
گرتے تھے اور سنبھالنے والا کوئی نہ تھا

دشمن تھا شہ کا اعور سلمی عدوے دیں
سر پر لگائی تیغ کہ شق ہو گئی جبیں
ماری جگر پر ابن انس نے سنان کیں
بھا گا گڑا کے کوکھ میں برچھی کو اک لعیں
گھوڑے پہ ڈگمگا کے جو حضرت نے آہ کی
تھرا گئی ضریح رسالت پناہ کی

گرتے ہیں اب حسین فرس پر سے ہے غضب
نکلی رکاب پاے مطہر سے ہے غضب
پہلو شگافتہ ہوا خنجر سے ہے غضب
غش میں جھکے عمامہ گرا سر سے ہے غضب
قران رحل زیں سے سر فرش گر پڑا
دیوار کعبہ بیٹھ گئی عرش گر پڑا

گر کر کبھی اٹھے کبھی رکھا زمیں پہ سر
اگلا کبھی لہو تو سنبھالا کبھی جگر
حسرت سے کی خیام کی جانب کبھی نظر
کروٹ کبھی تڑپ کے ادھر لی کبھی ادھر
اٹھ بیٹھے جب تو زخموں سے برچھی کے پھل گرے
نیر اور تن میں گڑ گئے جب منہ کے بھل گرے

جنگل سے آئی فاطمہ زہرا کی یہ صدا
امت نے مجھ کو لوٹ لیا وا محمدا
اس وقت کون حق محبت کرے ادا
ہے یہ ظلم اور دو عالم کا مقتدا
انیس سو ہیں زخم تن چاک چاک پر
زینب نکل، حسین تڑپتا ہے خاک پر

پردہ الٹ کے بنت علی نکلی ننگے سر
لرزاں قدم خمیدہ کمر غرق خوں جگر
چاروں طرف پکارتی تھی سر کو پیٹ کر
اے کربلا بتا ترا مہمان ہے کدھر
اماں قدم اب اٹھتے نہیں تشنہ کام کے
پہونچا دو لاش پر مرے بازو کو تھام کے

اسوقت سب جہاں مری آنکھوں میں ہے سیاہ
لوگو خدا کے واسطے مجھ کو بتاؤ راہ
سید کدھر تڑپتا ہے اماں کدھر ہیں آہ
کس سمت ہے نبی کے نواسے کی قتلگاہ

شعلے دل و جگر سے نکلتے ہیں آہ کے
یہ کون نام لیتا ہے میرا کراہ کے

کسنے صدا یہ دی کہ بہن اسطرف نہ آؤ
بس اب سفر قریب ہے اللہ گھر میں جاؤ
اب ڈوبتی ہے آل رسولؐ خدا کی ناؤ
یا مرتضٰے غریبوں کے بیڑے کو تم بچاؤ

اب چھوڑیو نہ دشت بلا میں حسین کو
یا فاطمہ چھپالو ردا میں حسین کو

بنت علی تو پیٹتی پھرتی تھی ننگے سر
کٹتا تھا نورچشم علی کا گلا ادھر
زینب کو منع کرتے تھے ہرچند اہل شر
لیکن وہ دوڑی جاتی تھی بھائی کی لاش پر

پہونچی جو قتلگاہ میں اس روک ٹوک پر
دیکھا سر حسین کو نیزے کی نوک پر

نیزے کے نیچے جا کے پکاری وہ سوگوار
سید تری لہو بھری صورت کے میں نثار
ہے ہے گلے پہ چل گئی بھیا چھری کی دھار
بھولے بہن کو اے اسد حق کے یادگار

صدقے گئی لٹا گئے گھر وعدہ گاہ میں
جنبش لبوں کو ہے ابھی ذکر آلہ میں

بھیا سلام کرتی ہے خواہر جواب دو
چلا رہی ہے دختر حیدر جواب دو

سوکھی زباں سے بھر پیمبر جواب دو
کیونکر جیے گی زینب مضطر جواب دو

جز مرگ درد ھجر کا چارا نہیں کوئی
میرا تو اب جہاں میں سہارا نہیں کوئی

بھیا میں اب کہاں سے تمہیں لاؤں کیا کروں
کیا کہکے اپنے دلکو میں سمجھاؤں کیا کروں
کسکی دھائی دوں کسسے چلاؤں کیا کروں
بستی پرائی ھے میں کدھر جاؤں کیا کروں

دنیا تمام اجڑ گئی ویرانہ ہو گیا
بیٹھوں کہاں کہ گھر تو عزاخانہ ہو گیا

ھے ھے تمہارے آگے نہ خواھر گذر گئی
بھیا بتاؤ کیا نہ خنجر گذر گئی
آئی صدا نہ پوچھو جو ھم پر گذر گئی
صد شکر جو گذر گئی بہتر گذر گئی

سر کٹ گیا ھمیں تو الم سے فراغ ھے
گر ھے تو بس تمہاری جدائی کا داغ ھے

گھر لوٹنے کو آئے گی اب فوج نابکار
کہیو نہ کچھ زباں سے بجز شکر کردگار
خیمے میں جب کہ آگ لگا دیں ستم‌شعار
رھیو میری یتیم سکینہ سے ھوشیار

بیزار ھے وہ خستہ جگر اپنی جان سے
باندھے نہ کوئی اس کا گلہ ریسمان سے

بس اے انیس ضعف سے لرزاں ہے بند بند
عالم میں یادگار رہیں گے یہ چند بند
نکلے قلم سے ضعف میں کیا کیا بلند بند
عالم پسند لفظ ہیں سلطاں پسند بند
یہ فصل اور یہ بزم عزا یادگار ہے
پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے

۲ - ترکیب بند - مرتبہ ۱۲۸۵ ہجری

مرثیہ جناب مرزا اسداللہ خان دہلوی مرحوم موسوم بہ غالب

کیا کہوں حال درد پنہانی
وقت کوتاہ و قصہ طولانی
عیش دنیا سے ہو گیا دل سرد
دیکھ کر رنگ عالم فانی
کچھ نہیں جز طلسم خواب و خیال
گوشۂ فقر و بزم سلطانی
ہے سراسر فریب، وہم و گماں
تاج فغفور و تخت خاقانی
بے حقیقت ہے شکل موج سراب
جام جمشید و راح ریحانی
لفظ مہمل ہے نطق اعرابی
حرف باطل ہے عقل یونانی

ایک دھوکا ہے لحن داؤدی
اک تماشا ہے حسن کنعانی

نہ کروں تشنگی میں تر لب خشک
چشمۂ خضر کا ہو گر پانی

لوں نہ اک مشت خاک کے بدلے
گر ملے خاتم سلیمانی

بحر ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

جس سے دنیا نے آشنائی کی
اس سے آخر کو کج ادائی کی

تجھ پہ پھولے کوئی عبث اے عمر
تو نے کی جس سے بیوفائی کی

ہے زمانہ وفا سے بیگانہ
ہاں قسم مجھ کو آشنائی کی

یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اسکی
صلح میں چاشنی لڑائی کی

ہے یہاں حظ وصل سے محروم
جس کو طاقت نہ ہو جدائی کی

ہے یہاں حفظ وضع سے مایوس
جس کو عادت نہ ہو گدائی کی

خندۂ گل سے بےبقاتر ہے
شان ہو جس میں دلربائی کی

جنس کاسد سے نارواتر ھے
خوبیاں جس میں ہوں خدائی کی

بات بگڑی رہی سہی افسوس
آج خاقانی و سنائی کی

رشک عرفی و فخر طالب مرد
اسداللہ خان **غالب** مرد

بلبل ھند مر گیا ھیہات
جسکی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ‌دان نکتہ سنج نکتہ شناس
پاک دل پاک ذات پاک صفات

شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج
رند اور مرجع کرام و ثقات

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اسکی سیدھی بات

دل میں چھپتا تھا وہ اگر بمثل
دن کو کہتا تھا دن تو رات کو رات

ھو گیا نقش دل پہ جو لکھا
قلم اس کا تھا اور اس کی دوات

تھیں تو دلّی میں اسکی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اس کے مرنے سے مر گئی دلّی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

یاں اگر بزم تھی تو اسکی بزم
یاں اگر ذات تھی تو اس کی ذات

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جب اسکی یاد آئیں
کس کی باتوں سے دل کو بہلائیں

کس کو جا کر سنائیں شعر و غزل
کس سے داد سخن وری پائیں

مرثیہ اس کا لکھتے ہیں احباب
کس سے اصلاح لیں کدھر جائیں

پست مضمون ہے نوحۂ استاد
کس طرح آسماں پہ پہنچائیں

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں
اہل میت جنازہ ٹھرائیں

لائینگے پھر کہاں سے غالب کو
سوے مدفن ابھی لے جائیں

اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح
اہل انصاف غور فرمائیں

قدسی و صائب و اسیر و کلیم
لوگ جو چاہیں ان کو ٹھہرائیں

ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے
ہے ادب شرط منھ نہ کھلوائیں

غالب نکته دان سے کیا نسبت
خاک کو آسمان سے کیا نسبت

نثر حسن جمال کی صورت
نظم غنج و دلال کی صورت

تہنیت اک نشاط کی تصویر
تعزیت اک ملال کی صورت

قال اس کا وہ آئینہ جس میں
نظر آتی تھی حال کی صورت

اس کی توجیہ سے پکڑتی تھی
شکل امکاں محال کی صورت

اس کی تاویل سے بدلتی تھی
رنگ ھجراں وصال کی صورت

لطف آغاز سے دکھاتا تھا
سخن اس کا مآل کی صورت

چشم دوراں سے آج چھپتی ہے
انوری و کمال کی صورت

لوح امکان سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت

دیکھ لو آج پھر نہ دیکھوگے
غالب بیمثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج
اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
نازش خلق کا محمل نہ رہا
رحلت فخر روزگار ہے آج
تھا زمانے میں ایک رنگین طبع
رخصت موسم بہار ہے آج
بار احباب جو اٹھاتا تھا
دوش احباب پر سوار ہے آج
تھی ہر ایک بات نیشتر جسکی
اس کی چپ سے جگر فگار ہے آج
دل میں مدت سے تھی خلش جُسکی
وہی برچھی جگر کے پار ہے آج
دل مضطر کو کون دے تسکین
ماتم یار غمگسار ہے آج
تلخی غم کبھی نہیں جاتی
جان شیریں بھی ناگوار ہے آج
کس کو لاتے ہیں بہر دفن کہ قبر
ہمہ تن چشم انتظار ہے آج
غم سے پھرتا نہیں دل ناشاد
کس سے خالی ہوا جہاں آباد
نقد معنی کا گنجدان نہ رہا
خوان مضمون کا میزباں نہ رہا

ساتھ اس کے گئی بہار سخن
اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا

ہوا اک ایک کارواں سالار
کوئی سالار کارواں نہ رہا

رونق حسن تھا بیاں اس کا
گرم بازار مہ رخاں نہ رہا

عشق کا نام اس سے روشن تھا
قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا

ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں
گل و بلبل کا ترجماں نہ رہا

اہل ہند اب کرینگے کس پر ناز
رشک شیراز و اصفہاں نہ رہا

زندہ کیونکر رہے گا نام ملوک
بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا

کوئی ویسا نظر نہیں آتا
وہ زمین اور وہ آسماں نہ رہا

اٹھ گیا تھا جو مایہ دار سخن
کس کو ٹھہرائیں اب مدار سخن

کیا ہے جس میں وہ مرد کار نہ تھا
اک زمانہ کہ سازگار نہ تھا

شاعری کا کیا حق اس نے ادا
پر کوئی اس کا حق گذار نہ تھا

بے صلہ مدح و شعر بے تحسین
سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا
نذر سائل تھی جان تک لیکن
درخور ہمت اقتدار نہ تھا
ملک دولت سے بہرہ ور نہ ہوا
جان دینے پہ اختیار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی
سر بلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلا
دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زھد کے بدلے
زھد اس کا اگر شعار نہ تھا
ایسے پیدا کہاں ہیں مست و خراب
ہم نے مانا کہ ھوشیار نہ تھا

مظہر شان حسن فطرت تھا
معنی لفظ آدمیت تھا

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں
آج بلبل نہیں گلستاں میں
شہر سارا بنا ھے بیت حزن
ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں
ملک یکسر ھوا ھے بے آئیں
اک فلاطوں نہیں جو یوناں میں

ختم تھی اک زباں پہ شیرینی
ڈھونڈھتے کیا ہو سیب و رساں میں
حصر تھی اک بیاں پہ رنگینی
کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں
لب جادو بیاں ہوا خاموش
گوش گل وا ہے کیوں گلستاں میں
گوش معنی‌شنو ہوا بیکار
مرغ کیوں نعرہ زن ہے بستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی
شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں
نہ رہا جس سے تھا فروغ نظر
سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں
ماہ کامل میں آ گئی ظلمت
آب حیواں پہ چھا گئی ظلمت
ہند میں نام پائے گا اب کون
سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون
ہم نے جانی ہے اس سے قدر سلف
ان پہ ایماں لائے گا اب کون
اس نے سب کو بھلا دیا دل سے
اس کو دل سے بھلائے گا اب کون
تھی کسی کی نہ جس میں گنجائیش
وہ جگہ دل میں پائے گا اب کون

اس سے ملنے کو یاں ہم آئے تھے
جا کے دلی سے آئے گا اب کون

مر گیا قدردان فہم سخن
شعر ہم کو سنائے گا اب کون

مر گیا تشنۂ مذاق کلام
ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون

تھا بساط سخن میں شاطر ایک
ہم کو چالیں بتائے گا اب کون

شعر میں ناتمام ہے حالی
غزل اس کی بنائے گا اب کون

کم لنا فیہ من بکی و عویل
و عتاب مع الزمان طویل

اقبال

والدہ مرحوم کی یاد میں

ذرہ ذرہ دھر کا زندانئی تقدیر ہے
پردۂ مجبوری و بیچارگی تدبیر ہے

آسماں مجبور ہے شمس و قمر مجبور ہیں
انجم سیماب پا رفتار پر مجبور ہیں!

ہے شکست انجام غنچے کا سبو گل زار میں
سبزہ و گل بھی ہیں مجبور نمو گل زار میں
نغمۂ بلبل ہو یا آواز خاموش ضمیر
ہے اسی زنجیر عالمگیر میں ہر شے اسیر!
آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سر مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیل رواں
قلب انسانی میں رقص عیش و غم رہتا نہیں
نغمہ رہ جاتا ہے، لطف زیر و بم رہتا نہیں
علم و حکمت رہزن سامان اشک آہ ہے
یعنی اک الماس کا ٹکڑا دل آگاہ ہے!
گرچہ میرے باغ میں شبنم کی شادابی نہیں
آنکھ میری مایہ دار اشک عنابی نہیں!
جانتا ہوں آہ! میں آلام انسانی کا راز
ہے نوائے شکوہ سے خالی مری فطرت کا ساز
مرے لب پر قصہ نیرنگیٔ دوراں نہیں!
دل مرا حیراں نہیں، خنداں نہیں، گریاں نہیں
پر تری تصویر قاصد گریۂ پیہم کی ہے!
آہ! یہ تردید میری حکمت محکم کی ہے
گریۂ سرشار سے بنیاد جاں پائندہ ہے
درد کے عرفان سے عقل سنگدل شرمندہ ہے
موج دود آہ سے آئینہ ہے روشن مرا!!!
گنج آب آورد سے معمور ہے دامن مرا!!!

حیرتی ہوں میں تری تصویر کے اعجاز کا
رخ بدل ڈالا ہے جس نے وقت کی پرواز کا
رفتہ و حاضر کو گویا پا بپا اس نے کیا!
عہد طفلی سے مجھے پھر آشنا اس نے کیا!
جب ترے دامن میں پلتی تھی وہ جان ناتواں
بات سے اچھی طرح محرم نہ تھی جس کی زباں
اور اب چرچے ہیں جس کی شوخیٔ گفتار کے
بے بہا موتی ہیں جسکی چشم گوہر بار کے!
علم کی سنجیدہ گفتاری، بڑھاپے کا شعور
دنیوی اعزاز کی شوکت، جوانی کا غرور
زندگی کی اوج گاہوں سے اتر آتے ہیں ہم
صحبت مادر میں طفل سادہ رہ جاتے ہیں ہم
بے تکلف خندہ زن ہیں، فکر سے آزاد ہیں
پھر اسی کھوئے ہوے فردوس میں آباد ہیں!
کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار؟
کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بیقرار؟
خاک مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا
اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا؟
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا
گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفتر ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات
تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی !!
میں تری خدمت کے قابل جب ہوا، تو چل بسی
وہ جواں قامت میں ہے جو صورت سرو بلند!
تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبار زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا!!!
وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا!!!
تجھ کو مثل طفلک بیدست و پا روتا ہے وہ!
صبر سے ناآشنا صبح و مسا روتا ہے وہ!
تخم جس کا تو ہماری کشت جاں میں بو گئی
شرکت غم سے وہ الفت اور محکم ہو گئی
آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانۂ برنا و پیر
آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے؟ کس قدر آساں ہے موت!
گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت!!
زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں، آلام ہیں
کیسی کیسی دختران مادر ایام ہیں!!
کلبۂ افلاس میں، دولت کے کاشانے میں موت
دشت و در میں، شہر میں، گلشن میں، ویرانے میں موت
موت ہے ہنگامہ آرا قلزم خاموش میں!
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں!
نے مجال شکوہ ہے، نے طاقت گفتار ہے
زندگانی کیا ہے، اک طوق گلو افشار ہے!

قافلے میں غیر فریاد درا کچھ بھی نہیں !!
اک متاع دیدۂ تر کے سوا کچھ بھی نہیں !!

ختم ہو جائیگا لیکن امتحاں کا دور بھی
ہیں پسِ نُہ پردۂ گردوں ابھی دور اور بھی!

سینہ چاک اس گلستاں میں لالہ و گل ہیں تو کیا؟
نالہ و فریاد پر مجبور بلبل ہیں تو کیا؟

جھاڑیاں جن کے قفس میں قید ہے آہ خزاں
سبز کر دے گی انہیں باد بہار جاوداں

خفتہ خاک پے سپر میں ہے شرار اپنا تو کیا؟
عارضی محمل ہے یہ مشت غبار اپنا تو کیا؟

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں !!
ٹوٹنا جس کا مقدر ہو، یہ وہ گوہر نہیں !!

زندگی محبوب ایسی دیدۂ قدرت میں ہے
ذوق حفظ زندگی ہر چیز کی فطرت میں ہے

موت کے ہاتھوں سے مٹ سکتا اگر نقش حیات
عام یوں اسکو نہ کر دیتا نظام کائنات

ہے اگر ارزاں تو یوں سمجھو اجل کچھ بھی نہیں
جس طرح سونے سے جینے میں خلل کچھ بھی نہیں

آہ غافل موت کا راز نہاں کچھ اور ہے!
نقش کی ناپایداری سے عیاں کچھ اور ہے!

جنت نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب
موج مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب

موج کے دامن میں پھر اس کو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بیدردی سے نقش اپنا مٹا دیتی ہے یہ
پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا!
توڑنے میں اس کے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا
اس روش کا کیا اثر ہے ہئیت تعمیر پر؟
یہ تو حجت ہے ہوا کی قوت تعمیر پر!!
فطرت ہستی شہید آرزو رہتی نہ ہو!!
خوب تر پیکر کی اسکو جستجو رہتی نہ ہو!!
آہ سیماب پریشاں، انجم گردوں فروز
شوخ یہ چنگاریاں، ممنون شب ہے جنکا سوز
عقل جس سے سر بزانو ہے وہ مدت ان کی ہے
سر گزشت نوع انساں ایک ساعت ان کی ہے
پھر یہ انساں آں سوے افلاک ہے جسکی نظر
قدسیوں سے بھی مقاصد میں ہے جو پاکیزہ تر
جو مثال شمع روشن محفل قدرت میں ہے
آسماں اک نقطہ جس کی وسعت فطرت میں ہے
جس کی نادانی صداقت کے لیے بیتاب ہے
جس کا ناخن ساز ہستی کیلیے مضراب ہے
شعلہ یہ کمتر ہے گردوں کے شراروں سے بھی کیا؟
کم بہا ہے آفتاب اپنا ستاروں سے بھی کیا؟
تخم گل کی آنکھ زیر خاک بھی بیخواب ہے
کس قدر نشو و نما کے واسطے بیتاب ہے

زندگی کا شعلہ اس دانے میں جو مستور ہے
خودنمائی ، خودفزائی کے لیے مجبور ہے
سردئ مرقد سے بھی افسردہ ہو سکتا نہیں
خاک میں دب کر بھی اپنا سوز کھو سکتا نہیں
پھول بنکر اپنی تربت سے نکل آتا ہے یہ!
موت سے گویا قبائے زندگی پاتا ہے یہ!!
ہے لحد اس قوت آشفتہ کی شیرازہ بند
ڈالتی ہے گردن گردوں میں جو اپنی کمند!
موت تجدید مذاق زندگی کا نام ہے!
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے!
خوگر پرواز کو پرواز میں ڈر کچھ نہیں!
موت اس گلشن میں جز سنجیدن پر کچھ نہیں
کہتے ہیں اہل جہاں درد اجل ہے لادوا
زخم فرقت وقت کے مرہم سے پاتا ہے شفا
دل مگر غم مرنے والوں کا جہاں آباد ہے
حلقۂ زنجیر صبح و شام سے آزاد ہے
وقت کے افسوں سے تھمتا نالۂ ماتم نہیں
وقت زخم تیغ فرقت کا کوئی مرہم نہیں
سر پہ آجاتی ہے جب کوئی مصیبت ناگہاں
اشک پیہم دیدۂ انساں سے ہوتے ہیں رواں
ربط ہو جاتا ہے دل کو نالہ و فریاد سے
خون دل بہتا ہے آنکھوں کی سرشک آباد سے

آدمی تاب شکیبائی سے گو محروم ہے
اس کی فطرت میں یہ اک احساس نامعلوم ہے

جوہر انساں عدم سے آشنا ہوتا نہیں
آنکھ سے غائب تو ہوتا ہے، فنا ہوتا نہیں

رخت ہستی چاک، غم کی شعلہ افشانی سے ہے
سرد یہ آگ اس لطیف احساس کے پانی سے ہے

آہ! یہ ضبط فغاں غفلت کی خاموشی نہیں!
آگہی ہے یہ دلاسائی، فراموشی نہیں!

پردۂ مشرق سے جس دم جلوہ گر ہوتی ہے صبح
داغ شب کا دامن آفاق سے دھوتی ہے صبح

لالۂ افسردہ کو آتش قبا کرتی ہے یہ
بے زباں طائر کو سرمست نوا کرتی ہے یہ

سینۂ بلبل کے زنداں سے سرود آزاد ہے
سینکڑوں نغموں سے باد صبحدم آباد ہے

خفتگان لالہ زار و کوہسار و رودبار
ہوتے ہیں آخر عروس زندگی سے ہمکنار

یہ اگر آئین ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح!!
مرقد انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح؟

دام سیمیں تخیل ہے مرا آفاق گیر!
کر لیا ہے جس سے تیری یاد کو میں نے اسیر

یاد سے تیری دل درد آشنا معمور ہے
جیسے کعبے میں دعاؤں سے فضا معمور ہے

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جسکا حیات
جلوہ گاہیں اسکی ہیں لاکھوں جہاں بے ثبات
مختلف ہر منزل ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولانگاہ ہے
ہے وہاں بے حاصلی کشت اجل کے واسطے
سازگار آب و ہوا تخم عمل کے واسطے
نور فطرت ظلمت پیکر کا زندانی نہیں
تنگ ایسا حلقۂ افکار انسانی نہیں
زندگانی تھی تری مہتاب سے تابندہ تر
خوب تر تھا صبح کے تارے سے بھی تیرا سفر
مثل ایوان سحر مرقد فروزاں ہو ترا!!
نور سے معمور یہ خاکی شبستاں ہو ترا
آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزہ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!

ساقی نامہ

دما دم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا رم زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی نمود
کہ شعلے میں پوشیدہ ہے موج دود!
گراں گرچہ ہے صحبت آب و گل
خوش آئی اسے محنت آب و گل

یہ ثابت بھی ہے اور سیار بھی
عناصر کے پھندوں سے بیزار بھی!
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر!
مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر!
یہ عالم یہ بتخانۂ شش جہات!
اسی نے تراشا ہے یہ سومنات!
پسند اس کو تکرار کی خو نہیں
کہ تو میں نہیں اور میں تو نہیں
من و تو سے ہے انجمن آفریں
مگر عین محفل میں خلوت نشیں
چمک اس کی بجلی میں تارے میں ہے
یہ چاندی میں سونے میں پارے میں ہے
اسی کے بیاباں اسی کے ببول
اسی کے ہیں کانٹے اسی کے ہیں پھول
کہیں اس کی طاقت سے کہسار چور
کہیں اس کے پھندے میں جبریل[۴] و حور
کہیں جرہ شاہین سیماب رنگ
لہو سے چکوروں کے آلودہ چنگ
کبوتر کہیں آشیانے سے دور!
پھڑکتا ہوا جال میں ناصبور
فریب نظر ہے سکون و ثبات
تڑپتا ہے ہر ذرۂ کائنات

ٹھہرتا نہیں کاروان وجود
کہ ہر لحظہ ہے تازہ شان وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پرواز ہے زندگی
بہت اس نے دیکھے ہیں پست و بلند
سفر اس کو منزل سے بڑھ کر پسند
سفر زندگی کے لیے برگ و ساز
سفر ہے حقیقت حضر ہے مجاز
الجھ کر سلجھنے میں لذت اسے!
تڑپنے پھڑکنے میں راحت اسے!
ہوا جب اسے سامنا موت کا
کٹھن تھا بڑا تھامنا موت کا
اتر کر جہان مکافات میں
رہی زندگی موت کی گھات میں
مذاق دوئی سے بنی زوج زوج
اٹھی دشت و کہسار سے فوج فوج!
گل اس شاخ سے ٹوٹتے بھی رہے!
اسی شاخ سے پھوٹتے بھی رہے!
سمجھتے ہیں نادان اسے بے ثبات
ابھرتا ہے مٹ مٹ کے نقش حیات!
بڑی تیز جولاں بڑی زود رس!
ازل سے ابد تک رم یک نفس!

زمانه کہ زنجیر ایام ہے
دموں کے الٹ پھیر کا نام ہے!

یہ موج نفس کیا ہے تلوار ہے!
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے!
خودی کیا ہے راز درونِ حیات!
خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات!
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند!
سمندر ہے اک بوند پانی میں بند!
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک!
من و تو میں پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے!
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
زمانے کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کے سہتی ہوئی
تجسّس کی راہیں بدلتی ہوئی
دمادم نگاہیں بدلتی ہوئی!
سبک اس کے ہاتھوں میں سنگ گراں!
پہاڑ اس کی ضربوں سے ریگ رواں!
سفر اس کا انجام و آغاز ہے!
یہی اس کی تقویم کا راز ہے!
کرن چاند میں ہے شرر سنگ میں!
یہ بیرنگ ہے ڈوب کر رنگ میں!

اسے واسطہ کیا کم و بیش سے!
نشیب و فراز و پس و پیش سے
ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر!
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے
فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے
خودی کے نگہباں کو ہے زہر ناب
وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لیے ارجمند
رہے جس سے دنیا میں گردن بلند
فر و فال محمود سے در گذر
خودی کو نگہ رکھ ایازی نہ کر
وہی سجدہ ہے لائق اہتمام
کہ ہو جس سے ہر سجدہ تجھ پر حرام!
یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت
یہ عالم کہ ہے زیر فرمان موت
یہ عالم یہ بتخانۂ چشم و گوش
جہاں زندگی ہے فقط خورد و نوش
خودی کی یہ ہے منزل اولیں
مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں
جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر
طلسم زمان و مکاں توڑ کر!
خودی شیر مولا جہاں اس کا صید!
زمیں اس کی صید آسماں اسکا صید!
جہاں اور بھی ہیں ابھی بےنمود
کہ خالی نہیں ہے ضمیر وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا
تیری شوخی فکر کردار کا
یہ ہے مقصد گردش روزگار
کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار!
تو فاتح عالمِ خوب و زشت!
تجھے کیا بتاؤں تری سرنوشت!
حقیقت پہ ہے جامہ' حرف تنگ!
حقیقت ہے آئینہ گفتار زنگ!
فروزاں ہے سینے میں شمع نفس
مگر تاب گفتار کہتی ہے بس!
"اگر یک سر موے برتر پرم
فروغ تجلی بسوزد پرم"

زندگی

برتر از اندیشۂ سود و زیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں، پیہم دواں، ہر دم جواں ہے زندگی

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوے کم آب
اور آزادی میں بحر بیکراں ہے زندگی

آشکارہ ہے یہ اپنی قوت تسخیر سے
گرچہ اک مٹی کے پیکر میں نہاں ہے زندگی

قلزم ہستی سے تو ابھرا ہے مانند حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

خام ہے جب تک کہ تو مٹی کا اک انبار ہے
پختہ ہو جاے تو ہے شمشیر بےزنہار تو

ہم نشیں افسانۂ بیداری جمہور چھیڑ
قصہ خواب آور اسکندر و جم کب تلک

ہمت عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل تیرے دامن میں شبنم کب تلک

آفتاب تازہ پیدا بطن گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوے تاروں کا ماتم کب تلک

توڑ ڈالیں فطرت انسان نے زنجیریں تمام
دوری جنت کو روتی چشم آدم کب تلک

باغباں چارہ فرما سے یہ کہتی تھی بہار
زخم گل کے واسطے سامان مرہم کب تلک

جوش ملیح آبادی

ظلمتیں

تیرگی لپٹی ہوئی ہے دھر میں ہر ضؤ کے ساتھ
عربدہ کرتا ہے یاں ہر راستہ رہرو کے ساتھ

لعل شیریں کے تبسم میں ہے غلطاں آہ سرد
ظلمتوں کی رو بھی ہے قندیل زر کی لو کے ساتھ

ہم نفس با ایں ہمہ برنائی و افسوں گری
بیوگی کا دبدبہ بھی ہے عروس نو کے ساتھ

اس قدر بھی ناز فرماتا ہے کوئی اے چمن
دھوپ بھی ہے ابر رنگا رنگ کے پرتو کے ساتھ

سن شیرین و غرور تاج کے ہوتے ہوئے
تیشہ فرہاد کا دھڑکا بھی ہے خسرو کے ساتھ

انجمن میں رات کو چپکے سے پا جاتا ہے بار
فتنۂ ظلمت نشاں بھی روشنی کی رو کے ساتھ

ڈوب جاتا ہے تڑپ کر سینۂ دریا میں جوش
سوز پیچ و تاب بھی تنویر ماہ نو کے ساتھ

روشنیاں

حرف ظلمت ہی نہیں ہے دیکھ تنویریں بھی
کاوش تخریب کی ہلچل میں تعمیریں بھی ہیں

جس جگہ خورشید کی حدت سے ہے عالم خموش
واں کسی دیوار کے سائے میں تقریریں بھی ہیں

جس جگہ مایوسیاں ہیں گردش تقدیر سے
واں کہیں امید کی پوشیدہ تدبیریں بھی ہیں

جس جگہ ژولیدہ عقدوں سے ہیں عقلیں سرنگوں
واں حیات و مرگ کی تابندہ تفسیریں بھی ہیں

جس جگہ منڈلا رہے ہیں مبہم و تاریک خواب
واں کسی گوشہ میں ان خوابوں کی تعبیریں بھی ہیں

جس جگہ تعزیر کے شایاں ہے ذوق نقش و رنگ
واں کہیں آئینوں میں رنگین تصویریں بھی ہیں

جس جگہ پانی میں ہے زہر ہلاہل کا اثر
واں ہوا میں چشمۂ حیواں کی تاثیریں بھی ہیں

جس جگہ دوڑی ہوئی ہیں سنگ خارا کی رگیں
واں درخشاں جوہروں کی نرم تحریریں بھی ہیں

ٹوٹتا ہے سلسلہ کب زلف عنبر بیز کا
میں نے مانا طوق بھی ہے جوش زنجیریں بھی ہیں

حفیظ جالندھری

تاروں بھری رات

بحر اور بر میں خشک اور تر میں
بیٹھی ہے چپ چاپ ہر رہگذر میں
نیندوں کے ماتے سوتے ہیں گھر میں !
خوابوں کے طائر دام نظر میں

رخ پوشیوں کا
مدھوشیوں کا ! !
خاموشیوں کا ! !
سودا ہے سر میں !

یہ کون دیکھے یہ کون جانے !
یہ کون سمجھے یہ کون مانے !

تاروں بھری رات !
نیلم پری رات

جلووں سے معمور نزدیک اور دور
آتی ہے کیونکر چھاتی ہے کیونکر

افسوں پڑھ کر
شاعر کے دل پر
کرتی ہے یکسر
جادوگری رات

تاروں بھری رات

(۲)

دنیائے انساں شہر خموشاں
دیکھے تو کوئی رنگ گلستاں
ہنستے ہیں غنچے کھلتی ہیں کلیاں!
ہر شاخ مسرور ہر پھول خنداں

سبزے میں ساری
پتوں پہ طاری
اک روح جاری
اک کیف لرزاں

ہر برگ گل میں موتی جڑے ہیں
موتی ہی موتی بکھرے پڑے ہیں

گویا دلہن ہے
گلشن کی ہر شے

گھونگٹ نکالے چہرے پہ ڈالے
تاریک آنچل باریک آنچل!!

دھندلی ضیا میں
شب کی ردا میں
اپنی حیا میں!!
چپ ہے مگن ہے
گویا دلہن ہے

(۳)

رکھوالا لڑکا کھیتوں کا دولہا
بنسی بجا کر گانے کا رسیا!

مینڈوں کے اوپر پھرتا ہے تنہا!
ہاتھوں میں بنسی پیروں سے ننگا!

البیلے پن میں
اصلی پھبن میں

گوکل کے بن میں
جیسے کنہیا

بنسی کی لے میں گم ہیں فضائیں
پھرتی ہیں مدھوش ہر سو ہوائیں!

جادو ہے، کیا ہے؟
یا معجزا ہے

کوہ و بیاباں کھیت اور میداں
با ہوش بیہوش سب خود فراموش

کیوں او گلے باز!
تیرا یہ انداز
یہ سوز یہ ساز
تجھ کو پتا ہے؟
جادو ہے، کیا ہے؟

---

(۴)

دلکش نظارے شب زاد سارے
ندی کی تہ میں رقصاں ہیں تارے
گاتی ہیں لہریں گیت ایسے پیارے
چپ دم بخود ہیں دونوں کنارے

ہر سمت سبزا
سرمست صہبا
لیٹا ہے کیسا
پاؤں پسارے

ہے سرسراہٹ خاموشیوں میں
یعنی ہوا ہے سرگوشیوں میں!

خاموش پانی
محو روانی!

چلتا مچلتا پہلو بدلتا
بہتا بہاتا کچھ گنگناتا

چپ ہے بظاہر
تاروں کا دفتر
سینے کے اندر
چاتر گیانی!

خاموش پانی!!

---

(۵)

دامان کہسار اک خامشی زار
چیل اور دیودار دیو ہیں کہ اشحار
توبہ ، درندے بےرحم ، خونخوار
لیکن یہاں بھی شب ہے طرحدار

پانی کی رو میں
ہر برگ نو میں
شبنم کی ضؤ میں
تارے نمودار!

یہ سرزمیں ہے آزاد دنیا
ہے تو یہیں ہے آباد دنیا

اے شان فطرت!
یہ خوان فطرت!

ہر ایک دیوی گل زار زادی!
اس وقت ہر جھیل ضؤ ریز قندیل

یہ رات کیا ہے
شان خدا ہے!
بکھرا پڑا ہے !
سامان فطرت!
اے شان فطرت

جاگ سوز عشق

جاگ سوز عشق جاگ!
جاگ سوز عشق جاگ!

جاگ کام دیوتا فتنہ ہائے نو جگا!
بجھ گیا ہے دل مرا پھر کوئی لگن لگا!
سرد ہو گئی ہے آگ
جاگ سوز عشق جاگ!

جاگ سوز عشق جاگ
پڑ گئی دلوں میں پھوٹ کیا بجوگ پڑ گیا
پرتھوی پہ چار کھونٹ ایک سوگ پڑ گیا
سر نگوں ہے شیش ناگ
جاگ سوز عشق جاگ!

جاگ سوز عشق جاگ
تو نے آنکھ بند کی کائنات سو گئی
حسن خود پسند کی دن سے رات ہو گئی
زرد پڑ گیا سہاگ
جاگ سوز عشق جاگ!

جاگ سوز عشق جاگ

اب نہ وہ سفر نہ سیر رہبری نہ رہزنی
کچھ نہیں ترے بغیر دوستی نہ دشمنی
اب لگاؤ ہے نہ لاگ!
جاگ سوز عشق جاگ!

جاگ سوز عشق جاگ

اے مغنیٔ شباب جاگ خواب ناز سے
دل شکستہ ہے رباب عرصۂ دراز سے!
مر گئے قدیم راگ
جاگ سوز عشق جاگ

جاگ سوز عشق جاگ

تو جو چشم وا کرے ہر امنگ جاگ اٹھے
آہ و نالہ جاگ اٹھے راگ رنگ جاگ اٹھے!
جوگ سے ملے بہاگ
جاگ سوز عشق جاگ

جاگ سوز عشق جاگ

پھر اسی اٹھان سے تیر اٹھے کماں اٹھے
صبر کی زبان سے شور الاماں اٹھے!

جاگ اٹھے دلوں کے بھاگ
جاگ سوز عشق جاگ!

جاگ سوز عشق جاگ
جاگ اے نظر فروز جاگ اے نظر نواز!
جاگ اے زمانہ سوز جاگ اے زمانہ ساز!
جاگ نیند کو تیاگ!
جاگ سوز عشق جاگ!

دیہات کی رات

چپکے چپکے گیت خاموشی کے گاتی ہے فضا
دیکھ کر تاروں کی جانب مسکراتی ہے فضا

اوڑھ کر اپنے تن نازک پہ چادر چاندنی
بام گردوں سے اترتی ہے زمیں پر چاندنی

مسجد و محراب سے شور اذاں اٹھتا نہیں
سرد اور خاموش چولھوں سے دھواں اٹھتا نہیں

لیٹ جاتی ہیں گھروں میں بیبیاں آرام سے
آدمی بےفکر ہو جاتے ہیں اپنے کام سے

ساگ لے لے کر گھروں میں پھرنیوالی عورتیں
شوخ اور منہ پھٹ مگر شب رنگ کالی عورتیں

سارا دن چکی پہ محنت کرنے والی لڑکیاں
کم سے کم اجرت پہ پانی بھرنے والی لڑکیاں

بھاری بھرکم اور ضدی گاؤں کے سادہ رئیس
پہلوانوں، مجلسوں، کتوں کے دلدادہ رئیس

مسجدوں کی کہنہ دیواروں کے رکھوالے امام
آئے دن پردیسیوں سے بحثنے والے امام

خانقاہوں کے مجاور اور بھک منگے فقیر
ادھ موے، گستاخ، سر اور پاؤں سے ننگے فقیر

موسمی گیتوں سے واقف خوش گلو میراثنیں
ہر کسی سے لڑنے والی تندخو میراثنیں

ڈوم جنکی مبتذل باتوں پہ سر دھنتے ہیں سب
اپنا اپنا من گھڑت شجرہ نسب سنتے ہیں سب

وہ مدرس جن کے دم سے مدرسہ آباد ہے
جنکو سعدی کی گلستاں کچھ زبانی یاد ہے

رفتہ رفتہ نیند سے مدھوش ہو جاتے ہیں سب
اور اس پر کیفیت وادی میں کھو جاتے ہیں سب

ہریانہ

کھینچ کر تقدیر لے آئی ہے ہریانے میں پھر
پھر رہا ہوں میں اسی آباد ویرانے میں پھر

کروٹیں لیتا ہے پانی سبزہ‌زاروں میں یہاں
ہے حیات جاودانی سبزہ‌زاروں میں یہاں

ریت میں بھکرے ہوے ہیں سخت پتھر ہر طرف
چرتے پھرتے ہیں ہرے کھیتوں میں ڈنگر ہر طرف
ندیاں کرتی ہیں باغوں میں طواف اشجار کا
اک طرف پھیلا ہوا ہے سلسلۂ اشجار کا

ہے یہاں ہر راستے کے موڑ پر تکیہ کوئی
دور سے آتا ہے کھیتوں میں نظر تکیہ کوئی
آنے جانے والے تھک کر بیٹھ جاتے ہیں یہاں
حقہ پینے والے اکثر بیٹھ جاتے ہیں یہاں
رونق بازار میں ٹوٹے ہوے بازار کچھ
ملتے ہیں تہذیب رفتہ کے یہاں آثار کچھ
اس جگہ حرص و ہوا کی گرم بازاری نہیں
مفلسوں کو بھی یہاں احساس ناداری نہیں
ہے تکلف سے مبرا زندگی انسان کی
ہوتی ہے سادہ‌دلی پر بارش اطمینان کی
حسب عادت روز مشرق سے نکل کر آفتاب
کاٹتا ہے نصف چکر ان کے سر پر آفتاب
جاری رہتا ہے تغیّر ہر گھڑی اوقات میں
رات دن میں جذب ہو جاتی ہے اور دن رات میں
دن مہینوں میں بدلتے ہیں مہینے سال میں
حال ماضی سے تو مستقبل زمان حال میں

سینکڑوں تبدیلیاں ہوتی ہیں اس دوران میں
کروٹیں لیتی ہے تہذیب جدید انسان میں
لیکن اس تہذیب کا ان پر اثر ہوتا نہیں
اس خرابے سے کسی شے کا گذر ہوتا نہیں

گاؤں کے مغرب کی جانب ایک قبرستان ہے
یہ بھی ایک محفل ہے لیکن محفل ویران ہے
سو رہے ہیں اس زمیں پر گاؤں کے سادہ رئیس
گاؤں کی معصوم آبادی کے دلدادہ رئیس
وقف تھی یہ بے وفا دنیا کبھی ان کے لیے
تھی غم و شادی کا مرکز زندگی ان کے لیے
تھا اثر موجود ان کی سرد آہوں میں کبھی
بجلیوں کے آشیانے تھے نگاہوں میں کبھی
ان کی پُرتاثیر تانوں سے فضا آباد تھی
آہ دنیا کو کبھی ان کی جوانی یاد تھی
آج وہ قبروں کی عزلت‌گاہ میں خاموش ہیں
اک گئے گذرے پرانے خواب میں مدھوش ہیں

اس زمیں سے میرا جسم ناتواں پیدا ہوا
اور میرے ساتھ ہی میرا جہاں پیدا ہوا
یہ فضائے صاف یہ ماہ مبیں یہ آسماں
یہ ہوا کے تیز جھونکے یہ زمیں یہ آسماں

یہ ستارے آسماں کی سطح پر بکھرے ہوے
کچھ ادھر بکھرے ہوے تو کچھ ادھر بکھرے ہوے

اپنی رو میں آپ ہر سو بہنے والی ندیاں
برشگالی فصل میں خوش رہنے والی ندیاں

بعد بارش دھوپ سے نکھرے ہوے آموں کے باغ
یہ تصور کی طرح بکھرے ہوے آموں کے باغ

سبز کھیتوں کی محافظ قد آدم جھاڑیاں
زلف کی مانند پیچیدہ و برہم جھاڑیاں

دوش پر نگہت کو لیکر گھومنے والی ہوا
ہر طرح کی قید سے آزاد متوالی ہوا

ہر دوراہے پر گلوں کا اک چمن آراستہ
ہر شجر پر طائروں کی انجمن آراستہ

خوشنما پھولوں کا مسکن یعنی ہر میدان سرخ
صبح کا بشاش چہرہ شام کا دامان سرخ

تھا کبھی موجود ان کے درمیان بچپن میرا
پھر رہا تھا بے تکلف شادماں بچپن میرا

جنت ارضی کبھی تھا میرا گھر میرے لیے
تھے کبھی شام و سحر، شام و سحر میرے لیے

دیہات کی صبح

جگمگا اٹھا وفور نور سے ایوان صبح
چہچہاتے ہیں درختوں پر بہم مرغان صبح

باغ میں پتوں کو آکر گدگداتی ہے صبا
خواب سے مونہہ بند کلیوں کو جگاتی ہے صبا
روشنی ہی روشنی حد نظر تک چھا گئی
رات کے جاگے ہوئے کتوں کو بھی نیند آگئی
آ رہی ہے کان میں چکی کی گھر گھر کی صدا
ہے فضا میں منتشر اللہ اکبر کی صدا
ننھے بچے کروٹیں لیتے ہوئے سو کر اٹھے
اٹھے لیکن با دل ناخواستہ رو کر اٹھے
لے رہا ہے اسطرح حقے کے تکیہ‌دار کش
ہر دفعہ کھنکارنے کے بعد ہیں دو چار کش
پھیل کر ہر سمت حقے کا دھواں اڑنے لگا
آسماں کے نیچے اور اک آسماں اڑنے لگا
چھیڑتے ہیں نیند کے ماتوں کو آ آ کر فقیر
پیٹ کی خاطر مرے جاتے ہیں گا گا کر فقیر
اٹھتے ہی کھیتوں کی جانب چودھری لمبے ہوئے
ھاتھ مونہہ دھویا ذرا سی چھاچھ پی لمبے ہوئے
وہ جنہیں کچھ ھیر کا قصہ زبانی یاد ہے
ان کی پرتاثیر تانوں سے فضا آباد ہے
موجۂ گل کی طرح اٹھکھلیاں کرتی ہوئی
لاکھ شوخی اور نزاکت سے قدم دھرتی ہوئی
صاف ململ کے دوپٹوں سے چھپائے جسم کو
اپنوں، غیروں کی نگاھوں سے بچائے جسم کو

گھر کا دکھڑا ساتھیوں سے راہ میں روتی ہوئی
مندروں، کھیتوں، گھروں کے پاس سے ہوتی ہوئی

راہ کی پگڈنڈیوں کے ساتھ ہی پھرتی ہوئی
کھیلتی ہنستی، ہنساتی، چھیڑتی، گرتی ہوئی

جارہی ہیں دیویاں اشنان کرنے کے لیے
ہاتھ مونھ دھونے نہانے اور نکھرنے کے لیے

میلے کپڑوں کی بہت سی گٹھریاں لادے ہوے
اپنے اپنے بیل پر رخت گراں لادے ہوے

جارہا ہے مختصر سا دھوبیوں کا قافلہ
اپنی نوعیت میں ہے یہ بھی انوکھا قافلہ

خوبصورت گھنگرو ہر بیل کی گردن میں ہیں
وہ جو آغاز سفر سے حالت شیوں میں ہیں

ان کی ٹن ٹن جس سے کوئی گوش نا محرم نہیں
سونے والوں کے لیے شور جرس سے کم نہیں

جس گلی سے جس محلے سے گذر جاتے ہیں یہ
نیند کے ماتوں کو بس بیدار کر جاتے ہیں یہ

آج بھی کل کی طرح دو چار کتے ساتھ ہیں
پہرہ دینے والے چوکیدار کتے ساتھ ہیں

اور کتّوں کی طرح لڑنے کے یہ عادی نہیں
اس لیے کوئی مسافر ان کا فریادی نہیں

———

عظمت اللہ خاں

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

کامنی کومل تھی تو حسنؔ رسیلا ترا
کوکتی کویل تھی تو شبد سریلا ترا
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

عشق کی دیوی تھی تو شعر میں یکتا تھی تو
حسن کی پتلی تھی تو ایک کویتا تھی تو
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

باز بہادر ترا حسن کا شیدا ترا
تونے اسے دل دیا ایک سراپا وفا
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

دکھ کی جو آئی گھڑی اور چھڑی راگنی
دن تھا نہ وہ رات تھی عیش کی محفل اٹھی
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

اکبری لشکر کی موج ایسی امڈ آئی تھی
باز بہادر کی فوج بکھری پھٹی کائی سی
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

باز بہادر ترا جان چھپا اڑ گیا
آنچ میں ڈالا گیا تیرا دل باوفا
پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

ایک طرف تھی وفا ایک طرف جان تھی
سچ کا تقاضا یہ تھا جان ہی قربان کی

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

کوئی زبردست ہاتھ تیری کڑی جھیلتا
دل کوئی مردانہ ساتھ جان پہ یوں کھیلتا

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

چاہ کا اپنی دیا ایسا دیا ہے جلا
اور بھی دے گا جلا سانس اسے وقت کا

پیت کی ماری ستی شاعرہ روپامتی

تصدق حسین خالد

یونہی

بچے
شوخ، شریر، آزاد،
دنیا بھر سے بے پروا
بچے
کھیلتے، کودتے، دوڑتے، ہنستے
گھاس میں لوٹتے
خاک اڑاتے
شور مچاتے،
بچے
ناچ رہے ہیں چکر میں،

تاروں نے اک شور مچایا
سورج بھاگا چاند کے پیچھے
چاند چھپا بادل کی اوٹ
تارے کھل کھل ہنسنے لگے
گانے لگے
خوب ہوئی جی خوب ہوئی
اب تو اپنی بہاریں ہیں
سورج، چاند، ستارے
کیا ہیں ؟
بچے
سب فطرت کے بچے -
ان کے کھیل وہی بچوں کے
یہ بھی ناچ کے ہیں متوالے
لے اور تال وہی ہیں
دنیا
بچوں والی دنیا
ایک خوشی سے ہے سرشار
وادی و کوہ و دشت و بیاباں
نکھرے نکھرے ، نور بھرے
مثل بہار صبح خنداں
رقص کی دعوت دیتے ہیں !

آنکھیں

گہریں جھیلیں
صدیوں کے بھیدوں کو چھپائے
سپنوں کا گہوارہ ـ،
تاروں کی چھاؤں کے نیچے
اوس نہائی کلیاں ـ،
پلکوں میں نیندوں کے جھولے ـ،
ساون کی آغوش ھی گویا،
بادل جھوم رہے ہیں،
گہری جھیلیں
آنکھیں!

تاثیر

ید بیضا

مجھے تلاش رہی ہے
نہیں تلاش نہیں
تلاش میں تو طلب
جستجو سی ہوتی ہے
دبی دبی ھی سہی
آرزو سی ہوتی ہے
نہ آرزو نہ طلب ہے نہ جستجو نہ تلاش
ذرا سی ایک جراحت ذرا سی ایک خراش

یہاں قلب و نظر اک مقام ہے اسکا
مقام؟ مرحلہ؟ جو کچھ بھی نام ہے اسکا

جہاں خیال کے پیکر بہائے جاتے ہیں
نگاہ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں

وہ طور جلوۂ معنی
وہ کارگاہ کمال

تصورات کی آلائشوں سے پاک خیال
تعینات سے بے پاک واردات جمال

ہوس نہ عشق نہ منزل نہ سرحدیں نہ حدود
جمال! تابشِ رو گرمئی خرام نہیں
ہزار ایسی ادائیں ہیں جن کا نام نہیں

یہ جھلکیاں
یہ ادائیں
یہ پر فشاں سائے
یہ جھلملاتے
ابھرتے
دبے ہوئے سے نقوش
سواد قوس و خم و گردش نشور و سرور!
یہ کائنات مری کائنات ہو، یہ نہیں
ہر ایک بات مگر میری بات ہو، یہ نہیں
میں دن کو رات بتاؤں تو رات ہو، یہ نہیں
نہیں! مجھے یہ خلش یہ ہوس نہیں ہوتی

بقدر جام یہاں اذن عام ہے سب کو

یہ میکدہ ہے یہاں پیش و پس نہیں ہوتی

مگر کبھی کوئی گم گشتہ رہ نورد غزال

مری کمند نظر کا شکار ہو جائے!

حریم ناز کا پردہ صبا الٹ ڈالے!

کسی کا راز دروں آشکار ہو جائے

یہ مدعا طلبی یہ نظر کی آلائش

یہ حسن رہ‌گذری یہ سرود نشر گہی

یہ شمع طاق حرم یہ نشرار بولہبی

یہ منتہائے نظر، یہ مآل کار نہیں

نہیں نہیں، کی یہ تکرار ہر جگہ یہ نہیں

کہ جیسے علم و عمل میں تضاد ہو جائے

کہ جیسے قلب و نظر میں فساد ہو جائے

کہ جیسے .... کیا میں کہوں!

یہ نہیں، یہ تشبیہیں

یہ اعتقاد کے اثبات کی نفی سے نہیں

وفور شوق کی جذبات کی کمی سے نہیں

بساط کیف ہے اک کارزار جوش نمود

روش روش ہمہ رامش چمن چمن ہمہ رنگ

خطوط نسخ و مناشیر و سنبل و ریحاں

نوائے بربط و طنبورہ و دف و نے و چنگ

نمود سربسر اظہار و کوہ کن یک تن

هزار پیکر شیریں فسرد و در رگ سنگ
کسی نے مسند سنگ سیہ پہ لی کروٹ
برنگ موج ابھرنے لگے نشیب و فراز
کھلا ہے ضربت تیشہ سے اک دریچۂ سرخ
قطار بستہ سیولے کھڑے ہیں محو نیاز
عمود ہمت و قوس نیاز و محور درد
بدن ڈھلے ہوئے انگڑائیوں میں بےسر و دست
تنے کسے ہوئے، سینے بلند سر بدمست

شکار ماہ کہ تسخیر آفتاب کروں
میں کس کو ترک کروں کس کا انتخاب کروں

وہ ایک اجنبی ساحل وہ شام تنہائی
حریف کثرت نظارہ دل کی یکتائی
جواب جوشش دریا صدف کی بینائی
وہ رنگ و صوت کا عالم حواس کی دنیا
وہ غور و فکر کی، خوف و ہراس کی دنیا
وہ ماورائے کا جہاں آس پاس کی دنیا
افق پہ وہ شفق آلودہ بادلوں کے ہجوم
مصوروں نے لگائے ہیں نقش رنگ برنگ
مچی ہوئی ہے چٹانوں میں جلترنگ کی دھوم
مغنیوں نے اڑائے ہیں موج کے آہنگ
مرے حروف، مرے لفظ، میرا طرز کلام
نہ ان میں لمس نہ رنگت، نہ ذائقہ نہ شام

چمن کا رنگ نہیں ہے گہر کی آب نہیں
مگر وہ کیا ہے کہ جس کا یہاں جواب نہیں

حکایت غم دل روئداد کون و مکاں
حدیث مطرب و مے حادثات دور زماں

جمال زہرہ جبیناں، جلال کجکلہاں
یہ چند حرف یہ لفظوں کے جوڑ یہ پیوند
ردیف و قافیہ و مثنوی و قطعہ و بند
مغاں کہ دانہ انگور آب می سازند
ستارہ می شکنند آفتاب می سازند

مرا کلام ہے میرا کلام ہی لیکن
یہ میری بات جو ہے میری اپنی بات نہیں
معاملات غزل ہیں معاملات غزل
یہ آپ بیتی، یہ میرے معاملات نہیں

وہ صبحدم سرمژگاں لہو سے تر آنسو
وہ نوک خار پہ شبنم کے ارغواں قطرے
لرز لرز کے جو سنبھلیں، سنبھل سنبھل ڈھلکیں
تصورات کی آمیزشیں یہ تشبیہیں!

یہ واقعات نہیں ہیں یہ واردات نہیں
یہ اور بات ہے قلب و نظر کی بات نہیں
کلیم غش میں گرا طور جل کے خاک ہوا
نظر کی بات رہی اور نہ دل کی بات رہی
شہود و شاہد و مشہود کے حدود کہاں

نہ اسکی ذات رہی اور نہ اسکی ذات رہی
مگر وہ ایک دھکتا ہوا نشاں کہ جو ہے
متاع عرض تماشا بس اور کچھ بھی نہیں
وہی کہ جس سے درخشاں ہے خاکنائے حیات
وہی کہ جس سے ہے لمحات زندگی کو ثبات

وہی حیات کا مقصد وہی بنائے حیات
وہی کہ ہے یدبیضا بس اور کچھ بھی نہیں
یہی ہے کچھ بھی نہیں اور کائنات مری
میری حیات ادب ہے ادب حیات مری
یہاں قلب و نظر اک مقام ہے اس کا
مقام ؟ مرحلہ ؟ جو کچھ بھی نام ہے اسکا
جہاں خیال کے پیکر بنائے جاتے ہیں
نگاہ گوش کو نغمے دکھائے جاتے ہیں

اختر شیرانی

جزیرۂ خواب

رنگیں (—) کچھ روحین کچھ کم سن روحیں دیکھ رہی ہیں خواب
معصومانہ خواب
زریں (—) روے عالم خواب ہے رقصاں کشتئی مہتاب
اک طفلانہ خواب
معصوم (—) ایک فضاے مسیمیں نور و نکہت سے معمور
سرشار و مدھوش

موہوم (—) ایک سواد رنگیں حسن و حیرت سے معمور
جنت کا ہمدوش

آزاد (—) نیند کی موجوں پر ہے رواں کشتئی خاموش
بزم جہاں سے دور

دلشاد (—) یہ روحیں آسودہ اس کشتئی میں مدھوش
کون و مکاں سے دور

ملاح (—) اس کی پری ہے نیند کی۔ جانا سوے وادئی خواب
نقش بہار خواب

خاموش (—) امن و سکوں کا ایک جزیرہ روئے وادئی خواب
ایک دیار خواب

فیض احمد فیض

۱

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(ایتھل اور جولیس اڈنبرگ کے
خطوط سے متأثر ہو کر لکھی گئی)

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ مارے گئے
تیرے ہاتھوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

———

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شام ستم
ہم چلے آئے ، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرف غزل، دل میں قندیل غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل‌گاہوں سے سب جا ملے
قتل‌گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے
جن کی راہ طلب سے ہمارے قدم
مختصر کر چلے درد کے فاصلے
کر چلے جن کی خاطر جہاں‌گیر ہم
جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

۲

شورش بابط و نے

پہلی آواز

اب سعی کا امکاں اور نہیں، پرواز کا مضموں ہو بھی چکا
تاروں پہ کمندیں پھینک چکے مہتاب پہ شبخوں ہو بھی چکا
اب اور کسی فردا کیلیے ان آنکھوں سے پیماں کیجئے
کس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکیں دل ناداں کیجیے
شیرنیئی لب خوشبوے دھن اب شوق کا عنواں کوئی نہیں
شادابئی دل تفریح نظر اب زیست کا درماں کوئی نہیں
جینے کے فسانے رہنے دو اب ان میں الجھ کر کیا لیں گے
اک موت کا دھندا باقی ہے جب چاہیں گے نپٹالیں گے
یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن، یہ میری لحد، وہ تیری ہے

دوسری آواز

ہستی کی متاع بے پایاں جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعل دل بسمل ہے تو کیا رخشاں ہے تو کیا
یہ بزم چراغاں رہتی ہے اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں گر ایام ترے، بدلا نہیں مسلک شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسم گل کے قدم قائم ہے جمال شمس و قمر
آباد ہے وادئی کاکل و لب شاداب و حسیں گلگشت نظر

مقسوم ہے لذت دردِ جگر، موجود ہے نعمت دیدۂ تر
اس ذوق نظر کا شکر کرو، اس دیدۂ تر کا شکر کرو
اس شام و سحر کا شکر کرو، ان شمس و قمر کا شکر کرو

پہلی آواز

گر ہے یہی مسلک شمس و قمر ان شمس و قمر کا کیا ہوگا
رعنائی شب کا کیا ہوگا، انداز سحر کا کیا ہوگا
جب خون جگر برفاب بنا جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اس دیدۂ تر کا کیا ہوگا اس ذوق نظر کا کیا ہوگا
جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں
یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے اس ذوق نظر کا کیا ہوگا
جب کنج قفس مسکن ٹھہرا اور جیب و گریباں طوق و رسن
آئے کہ نہ آئے موسم گل، اس دردِ جگر کا کیا ہوگا

دوسری آواز

یہ ہات سلامت ہیں جبتک اس خوں میں حرکت ہے جبتک
اس دل میں صداقت ہے جبتک اس نطق میں طاقت ہے جبتک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم سکھلائیں گے شورش بربط و نے
وہ شورش جسکے آگے زبوں دمامہ حشمت قیصر و کے
آزاد ہیں اپنے فکر و عمل، بھرپور خزینہ ہمت کا
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت امروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر یہ شمس و قمر یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ مال و حشم یہ لوح و قلم یہ طبل و علم سب اپنے ہیں

ن - م - راشد

۱

زنجیر

گوشہ زنجیر میں
اک نئی جنبش ہویدا ہو چلی
سنگ خارا ہی سہی، خار مغیلاں ہی سہی
دشمن جاں، دشمن جاں ہی سہی
دوست سے دست و گریباں ہی سہی
یہ بھی تو شبنم نہیں
یہ بھی تو مخمل نہیں، دیبا نہیں، ریشم نہیں

ہر جگہ پھر سینہ نخچیر میں
اک نیا ارماں، نئی امید پیدا ہو چلی
حجلۂ سیمیں سے تو بھی پیلہ ریشم نکل
وہ حسیں اور دور افتادہ فرنگی عورتیں
تو نے جن کے حسن روز افزوں کی زینت کے لئے
سالہا بے دست و پا ہو کر بنے ہیں تارہائے سیم و زر
ان کے مردوں کے لئے بھی آج اک سنگیں جال
ہو سکے تو اپنے پیکر سے نکال

شکر ہے دنبالۂ زنجیر میں
اک نئی جنبش، نئی لرزش ہویدا ہو چلی
کوہساروں، ریگ زاروں سے صدا آنے لگی

ظلم پروردہ غلامو ! بھاگ جاؤ
پردۂ شب گیر میں اپنے سلاسل توڑ کر
چار سو چھائے ہوئے ظلمات کو اب چیر جاؤ
اور اس ہنگام باد آور کو
حلہ شبخوں بناؤ !

بادل

(سانیٹ)

چھائے ہوئے ہیں چار طرف پارہ‌ہائے ابر
آغوش میں لیے ہوئے دنیائے آب و رنگ
میرے لیے ہے ان کی گرج میں سرود چنگ
پیغام انبساط ہے مجھکو صدائے ابر
اٹھی ہے ہلکے ہلکے سروں میں نوائے ابر
اور قطرہ‌ہائے آب بجاتے ہیں جل ترنگ
گہرائیوں میں روح کی جاگی ہے ہر امنگ
دل میں اتر رہے ہیں میرے نغمہائے ابر
مدت سے لٹ چکے تھے تمنا کے بار و برگ
چھایا ہوا تھا روح پہ گویا سکوت مرگ
چھوڑا ہے آج زیست کو خواب جمود نے
ان بادلوں سے تازہ ہوئی ہے حیات پھر
میرے لیے جوان ہے یہ کائنات پھر
شاداب کر دیا ہے دل ان کے سرود نے

۱

بیوپاری

جس پر بھی کوئی دکھ بیتے مجھ کو آ کے سناتا ہے
بپتا کی، راگنی میرے کان میں آ کر گاتا ہے

میں ہوں اک بھنڈار دکھوں کا میرے پاس خزانہ ہے
میں نے اوروں کے دکھ میں اپنے دکھ کو پہچانا ہے

آؤ آؤ سکھ لائے ہو، بولو مول بتاؤ تم
اپنے اپنے سکھ کے بدلے مجھ سے دکھ لے جاؤ تم

پل دو پل کا سکھ لائے ہو پل دو پل کا دکھ بھی ہے
جب دکھ لینے آئے ہو جیب میں ایسا سکھ بھی ہے

نقد کی بات کیا کرتا ہوں میرے پاس ادھار نہیں
تول میں کھوٹ ذرا آئے تو سودا پورم پار نہیں

بھائی ہمت کا سودا ہے، اپنی چاہ کا سودا ہے
ہنستے ہنستے آئے تو ہو پر سوچ لو آہ کا سودا ہے

سکھ کے بدلے دکھ تو کھرے ہیں پر یہ پرکھ تمہاری ہے
کون ہے پار پہنچنے والا کون نرا سنساری ہے

دنیا کے دکھ بیچ بیچ کر میرا جیون بیتا ہے
ہار ہار کر اپنی بازی میں نے جگ کو جیتا ہے

۲

اے پیارے لوگو
تم دور کیوں ہو
کچھ پاس آؤ
آؤ کہ مل لیں
یہ سب ستارے
تاریکیوں کے
اس پار ہونگے
اے پیارے لوگو
میں تم سے مل کر
بہتر بنوں گا
ایسے اکیلے
یوں روتے روتے
آنسو بہیں گے
اور کچھ نہ ہو گا
تم پاس آؤ
پھر دیکھ لیں گے
دنیا ہے کیا کچھ
اور دین کیا ہے
پھر جان لیں گے
ہر سانس کیسے
آنکھیں چھپکتے

ان مٹ بنا تھا
لیکن محبت
یہ کہہ رہی ہے
ہم دور ہی دور
اور دور ہی دور
چلتے رہیں گے

قیوم نظر

۱

شبخون

کالی، اندھی رات، بھیانک
پھیلی پھیلی خاموشی کا کالا جادو، اس میں اچانک
اک ہنگامہ —— سیل بلا سے
ذرہ ذرہ کانپ رہا ہے

دوڑ رہے ہیں وحشی گھوڑے
ہیبت ناک گھنی تاریکی مار رہی ہے آتشیں کوڑے
راج محل پیوند زمیں ہیں
شعلے ہیں اور ان کے مکیں ہیں

چمکی خوں آشام سیاہی
چیخیں، آہیں، ہچکیاں، نالے دہشت سے لپٹی ہے تباہی

راکھ کے ہر سو ڈھیر کھڑے ہیں
زندہ مردے جن میں گڑے ہیں

بڑھتے چڑھتے جنوں کے سہارے
مثل شہاب ثاقب پل میں   آئے گئے برسا کے شرارے

نقش پا ہے نہ راہگذر ہے
ویرانی تا حد نظر ہے

وحشی گھوڑے، مگر ہیں فسانے
وقت نے جس سے تراش لیے ہیں   الٹے سیدھے لاکھ بہانے

خواہش سیم و زر بھی نہیں ہے
فاقہ کشی کا ڈر بھی نہیں ہے

اسکندر ، چنگیز ہلاکو
یکساں تھا ان سب کی نظر میں   چشمۂ حیواں ، چشمۂ باکو

اب بھی وہی ہے فطرت آدم
بربادی میں ہے عظمت آدم

۲

جوانی

تو نے دیکھا ہے اسے
جاتے ہوئے، ارض حجاز
کتنا موزوں تھا جواں قد دراز
دل میں کھبا جاتا ہے

تو نے چاہا ہے اسے

مصر! ابوالہول جمال

کتنے مردانہ تھے اس کے خد و خال

درد بڑھا جاتا ہے

تو نے پایا ہے اسے

شمع شبستان فرانس

کس قدر گرم تھا اس کا ہر سانس

جسم جلا جاتا ہے

تو نے روندا ہے اسے

جنگ! لٹا میرا سہاگ

مادر گیتی، مرے واسطے جاگ

یوسف ظفر

۱

ولولے

آسماں پر چھا رہی ہیں بدلیاں

کاکلوں کی طرح لہراتی ہوئی

راگ میں ڈوبی ہوئی پرچھائیاں

آنچلوں کی طرح بل کھاتی ہوئی

چھا رہی ہیں جھومتی، گاتی ہوئی

خون کھولا جا رہا ہے کیا کروں
پیچ و خم کھاتا ہوا نیلا دھواں
روح پہ منڈلا رہا ہے کیا کروں
ولولوں کے ساز پر، دل میں نہاں
کوئی پیہم گا رہا ہے کیا کروں

گا رہا ہے گیت بے چنگ و نوا
جس طرح زلفوں کو پھیلائے کوئی
جس طرح چپکے سے آ جائے کوئی
جیسے آنکھوں کو نظر آئے کوئی
ایسے ہی آتی ہے کانوں میں صدا
جیسے لہراتی ہو لہروں پر ہوا
اور یوں محسوس ہوتا ہے مجھے
کوئی لہروں میں ڈبوتا ہے مجھے
ہر طرف ہے ایک محرابوں کا جال
دور تک پھیلا ہوا اک سلسلہ
جس طرح صحرا میں کوئی قافلہ
چھوڑ جاتا ہے نقوش پائمال
اس طرح محسوس ہوتا ہے مجھے
کوئی لہروں میں ڈبوتا ہے مجھے
ہانپتی لہریں ہیں دل کے آس پاس
گھومتے گرداب میرے پاس پاس

دائرے پھیلے ہوے ہیں دور تک
جس طرح لو دوڑتی ہے نور تک
حل ہوا جاتا ہوں میں گرداب میں
جل رہا ہے دل کے ایوانوں میں عُود
گیت ہیں یوں ذہن کے سیلاب میں
جس طرح گاتا ہو کوئی خواب میں
بے صدا، بے لفظ، بے ساز و سرود

رفتہ رفتہ ولولوں کا کارواں
چھوڑتا جاتا ہے قدموں کے نشاں
راستے کے پیچ و خم کے ساتھ ساتھ
جھومتا جاتا ہے صحرا کا غبار
ہر قدم پر ہر قدم کے ساتھ ساتھ
جس طرح ناچے کوئی دیوانہ وار
نغمہ ہائے زیر و بم، کے ساتھ ساتھ

۲

کھلونے

چنے میں نے موتی جواہر سے جیوتی بہاروں کے راگ
لیے میں نے خوشیوں سے خوشبو کے توشے
الٹ کر نگاہوں سے راہوں کے گوشے
بڑھا میں، چلا میں لیے ساتھ ساون کی پروا چناروں کی آگ
بہاروں کے راگ

نہ کام آئے موجوں کے موتی، جواہر کی جیوتی، نہ خوشبو نہ راگ
مقدر میں پیہم ہجوم شب غم
مسرت کا ماتم، مصیبت کا عالم
وہ سارے خزینے خزاؤں نے چھینے کہ سینے میں ہے اب چناروں کی آگ
نہ خوشبو نہ راگ
مدیں غم کی موجیں مصائب کی فوجیں رگ و پے کے اندر سمندر کے راگ
حقائق کا زنداں میں حیراں پریشاں
تصور تخیل تنفس سے نالاں
مجھی کو لگانے بجھانے کو پائی جہاں نے سہانے چناروں کی آگ
سمندر کے راگ
مگر تیرے دامن میں پھولوں کے مسکن میں سنتا ہوں اکثر بہاروں کے راگ
ترے نرم خوشے محبت کے توشے
میرے بھولے بھالے حسیں دل کے گوشے
مرے رنج و غم تیرے فکر و الم تو دکھاتے ہیں آ کر چناروں کی آگ
ستاروں کی آگ

مجاز

آوارہ

شہر کی رات اور میں ناشاد و ناکارہ پھروں
جگمگاتی جاگتی سڑکوں پہ آوارہ پھروں
غیر کی بستی ہے کب تک در بدر مارا پھروں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

یہ روپہلی چھاؤں ، یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور، جیسے عاشق کا خیال
آہ ! لیکن کون جانے ، کون سمجھے جی کا حال
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

جھلملاتے قمقموں کی راہ میں زنجیر سی
رات کے ہاتھوں میں دن کی موہنی تصویر سی
میری چھاتی پر ، مگر چلتی ہوئی شمشیر سی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

پھر وہ ٹوٹا اک ستارہ ، پھر وہ چھوٹی پھلجڑی
جانے کس کی گود میں آئی یہ موتی کی لڑی
ہوک سی سینے میں اٹھی، چوٹ سی دل پر پڑی
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

منتظر ہے ایک طوفان بلا میرے لیے
اب بھی جانے کتنے دروازے ہیں وا میرے لیے
اک مصیبت ہے مرا عہد وفا میرے لیے
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

عیش و دولت کے مظاہر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں سلطان جابر ہیں نظر کے سامنے
سینکڑوں — چنگیز و نادر ہیں نظر کے سامنے
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

بڑھ کے اس اندرسبھا کا ساز و سامان پھونک دوں
اس کا گلشن پھونک دوں، اس کا شبستاں جھونک دوں

تخت سلطاں کیا ہے سارا قصر سلطاں پھونک دوں
اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

۱

گونج

احمد ندیم قاسمی

رات کا پر وقار سناٹا
گونجتی ہے صدائے پائے نجوم
اصل میں گونج ہے سکوت کا گیت
اور پھر کس قدر لطیف و بسیط
گونج ہی گونج کبریا کی ذات
گونج ہی گونج ماورائے حیات
یہ حقیقت مگر کسے معلوم
زندگی گونج کے سوا کیا ہے
ایک انسان دوسرے کا نقیب
پھول کی گونج پھول کی مہکار
اور یہی ہے اثاثۂ گلزار
ایک اک پھول گلستاں کا غرور
ایک اک آدمی جہاں کا غرور
کاش سب کو مری نظر ہو نصیب
چاند پر شاخ گل لچکنے لگی
ہولے ہولے چلی عروس صبا
زندگی کے ورق الٹنے لگے
کتنے پردے نظر سے ہٹنے لگے

نوع انساں خدا سے جا کے ملی
ابتدأ انتہأ سے جا کے ملی
ٹوٹتا ہے فضا کا سناٹا

۲

فنون لطیفہ

یہ رقص و نغمہ، یہ شعر و ادب، یہ حکمت و فن
حیات کُش ہیں، نہیں ہیں اگر حیات آموز
فقط فسون تصور، فقط طلسم خیال
یہ آسماں کے ستارے نہیں زمین امروز
نکل کے دھند سے جو کہر میں اتر جائے
اس آفتاب کے طالب نہیں مرے شب و روز

وہی کرن ہے کرن ارتقاء کی نظروں میں
جو گھل کے ریشۂ گل میں نفود کر جائے
جو رنگ بن کے سما جائے کلیوں میں
جو آگ بن کے رگ سنگ میں اتر جائے
جو آبجو پہ گرے عکس بن کے تاروں کا
جو اوس بن کر لب آبجو بکھر جائے

شورش کاشمیری

تصویر

تصویر ہے کہ خندۂ لیل و نہار ہے
فطرت نے چاندنی کو سنوارا ہے اس طرح
سرو و سمن کا رنگ نکھارا ہے اس طرح
تصویر ہے کہ موج شمیم بہار ہے

آہنگ شعر ہے کہ مصور کا خواب ہے
اک آرزو ہے شاعر فطرت نگار کی
اک دل‌کشا صدا ہے نسیم بہار کی
مہتاب کی جھلک ہے ستاروں کی آب ہے

فطرت کا آئینہ ہے حیا کے وجود میں
شبنم کا لوچ قامت شعر و سخن میں ہے
یوناں کے بتکدوں کی نفاست بدن میں ہے
اک روح یاسمیں ہے صبا کے وجود میں

تصویر ہے کہ باد صبا کا نکھار ہے
کاغذ کے پیرہن میں نسیم بہار ہے

ساحر لدھانوی

آپ بے وجہ پریشان سی کیوں ہیں مادام!
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے

میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہو گی
میرے ماحول میں انسان نہ رہتے ہوں گے

نور سرمایہ سے ہے روئے تمدن کی جلا
ہم جہاں ہیں، وہاں تہذیب نہیں مل سکتی
مفلسی حس لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں ڈھل سکتی

لوگ کہتے ہیں تو لوگوں پہ تعجب کیسا ؟
سچ تو کہتے ہیں کہ ناداروں کی عزت کیسی
لوگ کہتے ہیں، مگر آپ ابھی تک چپ ہیں
آپ بھی کہیے غریبوں میں شرافت کیسی

نیک مادام ! بہت جلد وہ دور آئے گا
جب ہمیں زیست کے ادوار پرکھنے ہوں گے
اپنی ذلت کی قسم آپ کی عظمت کی قسم
ہم کو تعظیم کے معیار پرکھنے ہوں گے

ہم نے ہر دور میں تذلیل سہی ہے، لیکن
ہم نے ہر دور کے چہرے کو ضیاً بخشی ہے
ہم نے ہر دور میں محنت کے ستم جھیلے ہیں
ہم نے ہر دور کے ہاتھوں کو ضیا بخشی ہے

لیکن ان تلخ مباحث سے بھلا کیا حاصل ؟
لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے
میرے احباب نے تہذیب نہ سیکھی ہوگی
میں جہاں ہوں وہاں انسان نہ رہتے ہوں گے

مجید امجد

(ایک کوہستانی سفر کے دوران میں)

تنگ پگڈنڈی —— سر کہسار بل کھاتی ہوئی
نیچے دونوں سمت گہرے غار منہ کھولے ہوئے
آگے ڈھلوان کے پار اک تیز موڑ —— اور اس جگہ
اک فرشتے کی طرح نورانی پر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آ کے راستے پر کوئی نخل بلند
تھام کر جس کو گذر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے ڈگمگاتے رہرووں کے قافلے
ایک بوسیدہ خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امین
آہ ! گردن فرازان جہاں کی زندگی ——
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنہیں حاصل نہیں

مختار صدیقی

خیال درباری بلمپت

ان کے گانے میں ہے پرکاش، ذرا دیکھو تو
ایک اک تان سے ہیں نور کے سوتے جاری

تین صدیوں کے شب و روز جلو میں لے کر
سیکری لائی ہے گھمبیر، سجل درباری

یہ در و بام ہیں ساونت مغل کا پرتو
ہے ستونوں کی نفاست سے عیاں سنگینی

اونچی محرابوں کے گھیرے میں کشادہ ایوان
جس نے بیباک ارادوں کو بلندی بخشی

اسی ایوان میں ہے اکبر اعظم کا جلوس
سونے چاندی کے ستاروں سے چھتیں ہیں آکاس

ان گنت جھاڑ دمکتی ہوئی لاکھوں شمعیں
خلعتیں جن کی ہیں بلور کے شفاف لباس

''اہل دربار خبردار نگاہیں نیچی''
ان صداؤں میں وہ ہیبت ہے کہ دل تھرائے

ہاتھ باندھے ہیں حضوری میں امیران کبیر
آئی آواز کہ تشریف شہنشہ لائے

حضرت گیتی پنہ اکبر اعظم آئے
کوئی نظریں نہ اٹھانے پائے
اکبر اعظم آئے!

تر کماں حجرت اکبر آیو،،

اپ بلی تپ بلی دنیا میں خدا کا سایہ
جن کا دم بھرتا ہے انسان، ملک، چوپایہ
ان کے ہم آپ نہ بل بل جئے؟!،،
مرنے جینے کا اگر ان سے ''بندھنوا باندھو،،
پار ہو بیڑا کہ ہے ''پیر ہمارا سانچو،،
تر کہاں حجرت اکبر آیو ——— حجرت اکبر آیو،،

انترہ :-

آل تیمور کے سورج کی تجلی پھیلی
دکھ دلدر کے گھٹا ٹوپ اندھیرے بھاگے
وہ اجالا ہے کہ ''جگ جگ کے نصیبے جاگے،،
''اے ری جُگ جُگ کے نصیبے جاگے!،،
دو جہاں مطلع انوار ہوے ہیں، دیکھو،،
تر کہاں حجرت اکبر آیو ——— حجرت اکبر آیو

پھیلاؤ :-

روشنی تیز ہوئی
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی، فانوسوں کی
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی، فانوسوں کی اور شب کی دلہن
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی، فانوسوں کی اور شب کی دلہن شرمائی
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی، فانوسوں کی اور شب کی دلہن شرمائی،
لجا کر سمٹی

روشنی تیز ہوئی شمعوں کی، فانوسوں کی اور شب کی دلہن شرمائی،
لجا کر سمٹی، سمٹ کر بیٹھی

انہی شمعوں نے دیا چاند کا جھومر اس کو
دو جہاں مطلع انوار ہوے دیکھو تو
ترکہاں حجرت اکبر آیو —— حجرت اکبر آیو

جوت گانے کی بجھی بیتے زمانے بھاگے
کھینچ لیں تین سو برسوں نے طنابیں اپنی

قصر ویراں میں کہیں بوم کا نوحہ گونجا
سونپ دی راگ نے اس نوحے کو خوابیں اپنی

بیکراں رات سے محراب کی رفعت دونی
اور میں سایۂ محراب میں ہوں افتادہ

خشک خندق سے ادھر کوہ گراں دیواریں
اب کہاں جاؤں کہ رہبر نہ لسان جادہ

کس خرابے میں مجھے چھوڑ گئے، درباری!!

انجم رومانی

کوئی آوارہ

اندھیرے سے چاند اپنا دامن بچاتا ہوا
گزر جائے گا
اجالے میں ہم اپنے دل کو سنبھالے ہوے
گزر جائیں گے

کہے گا کوئی ابر پارہ کہانی عجیب
کہے جائے گا
رہے گا کوئی گیت آوارہ، دل کے قریب،
نہ یاد آئے گا

کسی پھول کی باس منڈلائے گی آس پاس
کرے گی اداس
کسی شام کا ملگجا سا سلگتا سماں
رہے گا جواں۔

محمد ہادی حسین

آندھی

آندھی — جیسے کسی ان ھونی بات کی اک اڑتی سی خبر
جس سے دنیا زیر و زبر

جھکڑ — جیسے روز بد کا جشن منائیں لاکھوں بھوت
انجانی بپتا کے دوت

دھرتی — مٹی کا اک ساگر جس سے اٹھا ھے طوفان
دل کے بخار کا اک بحران

مٹی — نکلا ھے آکاش کے ظلم و ستم سے آخر کار
دھرتی کے سینے کا غبار

پتے — گم گشتہ روحیں آوارہ فضا میں ملتی ھاتھ
حسرت اور افسوس کے ساتھ

طائر — نازک دل گھبرا کر ڈھونڈتے پھرتے راہ گریز
اُف یہ زیست کی رستاخیز!

انساں — لاکھوں آندھیوں کے طوفاں سینے میں دبائے ہوئے
سر آندھی سے چھپائے ہوئے

ابن انشا

چاند کے تمنائی

شہر دل کی گلیوں میں
شام سے بھٹکتے ہیں

چاند کے تمنائی بے قرار سودائی
دل گداز تاریکی جاں گداز تنہائی
روح و جاں کو ڈستی ہے روح و جاں میں بستی ہے

شہر دل کی گلیوں میں

تاک شب کی بیلوں پر شبنمیں سرشکوں کی
بے قرار لوگوں نے بے شمار لوگوں نے
یادگار چھوڑی ہے اتنی بات تھوڑی ہے

صد ہزار باتیں تھی حیلہ شکیبائی
صورتوں کی زیبائی قامتوں کی رعنائی
ان سیاہ راتوں میں ایک بھی نہ یاد آئی
جا بجا بھٹکتے ہیں کس کی راہ تکتے ہیں

چاند کے تمنائی

یہ نگر کبھی پہلے   اسقدر نہ ویراں تھا
کہنے والے کہتے ہیں   قریہ نگاراں تھا
خیر اپنے جینے کا   یہ بھی ایک ساماں تھا

آج دل میں ویرانی   ابر بن کے گھر آئی
آج دل کو کیا کہیے   با وفا نہ ہرجائی
پھر بھی لوگ دیوانے   آ گئے ہیں سمجھانے
اپنی وحشت دل کے   بُن لیے ہیں افسانے

خوش خیال دنیا نے

گرمیاں تو جاتی ہیں   وہ رتیں بھی آتی ہیں
جب ملول راتوں میں   دوستوں کی باتوں میں
جی نہ چین پائے گا   اور اوب جائے گا
آہٹوں سے گونجے گی   شہر دل کی پہنائی
اور چاند راتوں میں   چاندنی کے شیدائی
ہر بہانے نکلیں گے   آزمانے نکلیں گے
آرزو کی گیرائی   ڈھونڈنے کو رسوائی

سرد سرد راتوں کو
زرد چاند بخشے گا
بے حساب تنہائی
شہر دل کی گلیوں میں

مصحفی

جی جائیگا رائیگاں کسی کا
یوں کرتے ہیں امتحاں کسی کا

جز آہ وہاں کوئی کرے کیا
کچھ بس نہ چلے جہاں کسی کا

اے مرغ چمن یہیں نہ کر شور
میراث ہے گلستاں کسی کا

ق

تا فصل دگر رہا نہ ہرگز
اس باغ میں آشیاں کسی کا

عبث تو آشیاں بلبل کا اے صیاد لوٹے ہے
کوئی یوں بھی کسی کا خانہ آباد لوٹے ہے

صبا کے ہاتھ سے یوں گل لٹا ہوگا نہ گلشن میں
فلک جس طرح سے کر کے ہمیں برباد لوٹے ہے

پھنسا ہو جس کا دل گلشن میں کیا ذوق قفس سمجھے
گرفتاری کی لذت طائر آزاد لوٹے ہے

کلہ پوشاں نے یوں غارت کیا اس کشور دل کو
کہ جیسے فوج شاہ آ کر جہاں آباد لوٹے ہے

خواب تھا یا خیال تھا کیا تھا
ہجر تھا یا وصال تھا کیا تھا

چمکی بجلی سی پر نہ سمجھے ہم
حسن تھا یا جمال تھا کیا تھا

شب جو دل دو دو ہاتھ اچھلتا تھا
وجد تھا یا وہ حال تھا کیا تھا

جس کو ہم روز ہجر سمجھے تھے
ماہ تھا یا وہ سال تھا کیا تھا

مصحفی شب جو چپ تو بیٹھا تھا
کیا تجھے کچھ ملال تھا کیا تھا

دلّی ہوئی ہے ویران سونے کھنڈر پڑے ہیں
ویران ہیں محلے سنسان گھر پڑے ہیں

دیکھا تو اس چمن میں باد خزاں کے ہاتھوں
اکھڑے ہوے چمن سے کیا کیا شجر پڑے ہیں

بلبل کا باغباں سے اب کیا نشاں پوچھوں
بیروں در چمن کے اک مشت پر پڑے ہیں

عشق میں امتحان ہزاروں ہیں
خستہ و نیم جاں ہزاروں ہیں

آتش گل بھڑکیو بچ کے ذرا
باغ میں آشیاں ہزاروں ہیں

عشق کا قصہ ایک جا ھی نہیں
اس کی تو داستان ہزاروں ھیں

محمد حسین آزاد

مثنوی زمستان (انتخاب)

گرچہ ہر جا پہ تیرے چلتے قوانین ھیں اور
اے زمستاں ترے اس ملک میں آئین ھیں اور

ایک جھونکا جو ترے حکم کا آ جاتا ھے
تو نباتات کا سب رنگ بدل جاتا ھے

زرد ھو جاتے ھیں سب دشت سے کوھسار تلک
کوہ سے کاہ تلک، باغ سے اشجار تلک

عقل حیراں ھے کہ سونا یہ بکھیرا کس نے
آب زر روے نباتات پہ پھیرا کس نے

بعض اشجار پہ ھے حکم بہت سخت آتا
پتے پتے کو جلاتا ھوا یک لخت آتا

دل میں ہر برگ کے یوں آگ لگا دیتا ھے
جس طرح سے کوئی تانبے کو تپا دیتا ھے

ہر شجر پر ھے غرض رنگ بدل کر آتا
کہیں زرکار ھے آتا کہیں مسگر آتا

پر تیرے حکم کے جھونکے میں سوا تیزی ہے
که نباتات په طوفان بلا ریزی ہے

برگ دیکھو تو ہیں سب جھڑ کے سر خاک پڑے
اور شجر سب ہیں برهنه ته افلاک پڑے

دفعتاً پیر سحر سانس ہے بھرتا ایسا
یا زمانے په وہ کچھ سحر ہے کرتا ایسا

که جہاں آنکھوں میں ہو جاتا ہے یک بار سفید
دشت و کہسار سے لے تا در و دیوار سفید

ابر کی طرح بخارات کا گھر کا آنا
برف کے پردے میں وہ روئی دھنکتے جانا

ہلکے ہلکے کبھی مکڑی کے ہیں جالے اڑتے
اور ہوا میں ہیں کبھی روئی کے گالے اڑتے

جابجا آب رواں چلنے سے ہیں تھم جاتے
اور سر چشمه میں شیشے کی طرح جم جاتے

جو شجر گلشن ہستی میں برهنه تھے کھڑے
یا که پتوں کا بڑھائے ہوے گھنا تھے کھڑے

شجر نور سر طور نظر آتے ہیں
سر بسر غیرت بلور نظر آتے ہیں

ہے گذر جب که تیرا جانب دریا ہوتا
اک طلسمات کا گویا ہے تماشا ہوتا

ایسا تو حکمت و جادو سے جماتا ہے اسے
سر بسر تختۂ الماس بناتا ہے اسے

کاروانوں کی برابر ہیں قطاریں جاتی
جس طرح دشت میں ہرنوں کی ہیں ڈاریں جاتی

پل میں بے کشتی و پل پار اتر جاتے ہیں
سفری سینکڑوں بے لاگ گذر جاتے ہیں

روے دریا پہ گزر مثل نظر ہوتا ہے
ایسے جاتے ہیں کہ دامن نہیں تر ہوتا ہے

———